الناشر

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

برخود نظر کشا ، ز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو ماہِ تمامے نہادہ اند

اسلامی مدارس کا نصاب و نظام

تجزیہ ، تبصرہ ، مشورہ

از قلم:
حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب دامت برکاتہم
(بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم ، بنگلور)

النّاشِر
مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

نام کتاب	:	اسلامی مدارس کا نظام ونصاب تجزیہ-تبصرہ- مشورہ
مصنف	:	حضرت اقدس مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب دامت برکاتہم
صفحات	:	۷۲
تاریخ طباعت	:	شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ مطابق مئی ۲۰۱۵ء
ناشر	:	مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور
موبائل نمبر	:	9634307336 \ 9036701512
ای-میل	:	maktabahmaseehulummat@gmail.com

فہرس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

نحمده و نصلي على رسوله الكريم ، أما بعد:

''رابطۂ مدارسِ اسلامیہ، دار العلوم دیو بند'' کی صوبائی شاخ ''رابطۂ مدارس اسلامیہ کرناٹک'' کا ایک اجلاسِ عاملہ چند سال قبل بہ مقام ''دار العلوم شاہ ولی اللہ، بنگلور'' ہونا طے پایا تھا، اس اجلاس کے لیے احقر کو ''مدارس میں تعلیم وتربیت اور انتظامیہ میں اصلاح کی ضرورت'' کے عنوان پر علما و ذمے داران مدارس کے سامنے گفتگو کرنے کا حکم دیا گیا۔ احقر نے اس کے لیے اس عنوان میں ہلکی سی ترمیم کر کے ''اسلامی مدارس کا نظام و نصاب - تجزیہ، تبصرہ، مشورہ'' پر ایک مقالہ لکھا اور اجلاس میں حضراتِ علمائے کرام و ذمے دارانِ مدارس کے سامنے اکابر کے حکم کی تعمیل میں پیش کر دیا، جس کو حاضرینِ مجلس نے پسند فرمایا اور اسی وقت بہت سے علما نے اس کی فوٹو کاپی کرائی اور بعض حضرات نے اس کو شائع کرنے کا مطالبہ کیا۔

بالخصوص مولانا مفتی شمس الدین صاحب بجلی قاسمی حفظہ اللہ (استاذ دار العلوم شاہ ولی اللہ، بنگلور) نے کئی بار اس کا تقاضا فرمایا؛ لیکن میں نے اس کو مزید مدلل و مرتب انداز میں پیش کرنا چاہا، جس کے لیے وقت کی ضرورت تھی، چناں چہ اس کے بعد اس کو مزید حوالجات سے مدلل اور نئی ترتیب سے مرتب کر لیا گیا۔

مگر دیگر مصروفیات کی وجہ سے اس کی اشاعت کی جانب کوئی توجہ نہیں دی جا سکی

اور یہ مسودہ پڑا رہا اور بہ مصداق: ''كُلّ أمرٍ مَرهُون بأوقَاتِه ''اس کا وقت اب آیا اور یہ اب اشاعت کے لیے جا رہا ہے۔

زیر نظر تحریر وہی مقالہ ہے، جس کو کچھ اضافوں اور ترمیمات کے ساتھ اور مزید حوالجات سے مدلل کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کو نافع و مفید بنائے۔

محمد شعیب اللہ خان
جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور
۲/ذی الحجہ، ۱۴۳۲
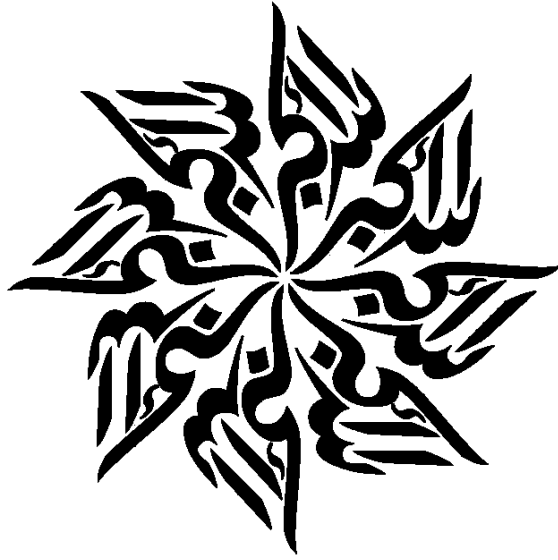
بسم اللہ الرحمن الرحیم

دینی مدارس میں تعلیم، تربیت اور انتظامیہ میں اصلاح کی ضرورت

الحمد لله ربِّ العٰالمین ، والصلاة والسلام علی سیدنا محمّدٍ رسولِ اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم ، وعلی آله وصحبه أجمعین. أما بعد:

حضراتِ علمائے وفضلائے کرام اور صوبے کے مختلف دینی وعلمی اداروں سے تشریف لائے ہوئے ذمہ داران!

آج کے اس اہم اجلاس میں مجھے جو موضوع دیا گیا ہے، وہ ہے ''مدارس میں تعلیم وتربیت اور انتظامیہ میں اصلاح کی ضرورت''۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ ایک نہیں؛ بل کہ دراصل تین عنوانات ہیں :ایک: نصابِ تعلیم میں اصلاح سے متعلق، دوسرے: نظامِ تربیت میں اصلاح سے متعلق اور تیسرے: انتظامیہ میں اصلاح سے متعلق اور یہ بھی واضح ہے کہ ان میں سے ہر عنوان طویل الذیل اور ایک لمبے وقت کا متقاضی ہے؛ مگر وقت کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے میں کوشش کروں گا، کہ ان عناوین سے متعلق اہم گوشوں کو آپ کے سامنے پیش کروں۔

حضرات! یہ بات واضح ومسلم ہے کہ مدارس اسلامیہ کا نصب العین ''تعلیمِ دین و

تربیتِ اخلاق'' ہے؛ لہٰذا اہلِ مدارس کی ذمے داری ہے کہ وہ اس نصب العین کے پیشِ نظر اُس راہ وسبیل کو اختیار کریں، جو اس نصب العین میں مفید ومعین ہو اور ہر اس طریق سے احتراز کریں، جو نقصان دہ یا غیر مفید ہو۔ اس سلسلے میں چند اہم امور کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔

تعلیمی نصاب

سب سے پہلے تعلیم کو لیجیے! اس میں دو باتوں پر مجھے عرض کرنا ہے: ایک نصابِ تعلیم پر اور دوسرے: نظامِ تعلیم پر۔ عام طور پر جب بھی نصابِ تعلیم کا مسئلہ سامنے آتا ہے، تو ذہنوں میں لازماً یہ بات آتی ہے، کہ نصاب میں تبدیلی وترمیم کا مسئلہ زیرِ بحث آئے گا؛ مگر میں اس کے متعلق اس وقت کچھ کہنا نہیں چاہتا؛ کیوں کہ اس مسئلے پر اب تک ہزاروں صفحات لکھے جا چکے ہیں، بعض لوگ مروجہ نصابِ تعلیم میں تبدیلی لانے کے نظریے کی تائید کرتے ہیں، تو دوسرے حضرات اس کے خلاف مروجہ نصاب کی حمایت کرتے ہیں اور اس مسئلے نے کافی طول کھینچا اور طرفین کی جانب سے اخبارات وجرائد، رسائل وکتب میں اس پر بحثیں ہوئیں اور اب تک جاری ہیں؛ لہٰذا میں اس وقت اس مسئلے پر خامہ فرسائی کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔

نصابِ تعلیم کا اصل مقصد کیا ہے؟

البتہ اس سلسلے میں اہلِ مدارس کو ایک بات پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دینا چاہیے، وہ یہ کہ ہمارے ''نصابِ تعلیم'' کا اصل مقصد وہدف، دین کے داعی وسپاہی، قرآن وسنت کے مستند مفسر وشارح، تعلیماتِ اسلام کے مخلص معلم ومبلغ اور ملت کے بے لوث وسچے خادم ورہبر پیدا کرنا ہے، جو اپنی ذمے داریوں کو نباہتے ہوئے وقت کے تقاضوں، زمانے کی نزاکتوں، لوگوں کے مزاجوں، عرف وعادت کی تبدیلیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے

امت کو صحیح و سچے دین کی رہنمائی دیں، باطل طاقتوں کا علمی و عملی طور پر جواب دیں اور دین اسلام کی حفاظت واشاعت کا کام خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیں۔

اس مقصد کے پیشِ نظر جو اصلاح وترمیم ''نصابِ تعلیم'' میں کی جا سکتی ہے اور اس ضرورت کے لیے جن مضامین کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی ترمیمات و اصلاحات کا سلسلہ ایک زمانے سے چل رہا ہے، چناں چہ مروجہ ''درسِ نظامی'' کی جو شکل آج ہے، وہ اُس صورت سے بہت حد تک مختلف ہے، جو دورِ اول میں تھی، پچاسوں کتابیں اس سے اب خارج کر دی گئی ہیں اور متعدد نئی کتابیں اس میں داخل کر دی گئی ہیں، جو اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ عملاً ہر دور میں ''اصلاح وترمیم'' کا کام انجام پا تا رہا ہے۔

مگر جب بعض حلقوں کی جانب سے مروجہ ''درسِ نظامی'' کو ایک فرسودہ ولا یعنی نصاب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اور اس میں خامیاں تلاش کی جانے لگیں اور اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر یہ ہوا، کہ ان کی دیکھا دیکھی منکرینِ مدارس کی جانب سے ان مدارس کی افادیت کا یکسر انکار کیا جانے لگا اور ان مدارس کی ہیئتِ کذائیہ کو بدل کر کالجوں میں انھیں تبدیل کرنے کے مشورے اور تجاویز بھی دیے جانے لگے، تو لا محالہ دوسرے طبقے کی طرف سے اس کا جواب دینا پڑا اور بحث نے طول پکڑ لیا؛ ورنہ جہاں تک بندے کا خیال ہے، نصاب میں ترمیم و اصلاح کے سلسلے کا اختلاف کوئی حقیقی اختلاف نہیں؛ بل کہ محض صوری اختلاف ہے، جس طرح کسی زمانے میں ''ایمان میں کمی بیشی'' وغیرہ مسائل پر بعض بڑے بڑے حضرات نے کتب ورسائل لکھے اور اختلاف نے بحث ومناظرے تک نوبت پہنچا دی؛ مگر جب اصلیت سامنے آئی تو پتہ چلا، کہ ان میں سرے سے کوئی حقیقی اختلاف تھا ہی نہیں، اسی طرح یہاں بھی ہے کہ ضرورت کی بنا پر نصاب میں ترمیم تو بہت پہلے سے جاری ہے اور اس میں

کسی کو کوئی اختلاف نہیں؛ مگر پھر بھی اختلاف کی ایک صورت قائم ہے۔

الغرض اس وقت اس مسئلے پر کچھ کہنا مجھے مقصود نہیں؛ البتہ مذکورہ بالا ہدف و مقصد کے پیشِ نظر ہمارے نصاب میں جن باتوں کا مزید اہتمام ہونا چاہیے، اس کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

عربی زبان کی مہارت

ان میں سے ایک یہ ہے کہ عربی صرف ونحو اور ادب کی تعلیم کا چوں کہ اصل مقصد عربی زبان پر عبور ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ ایسی کتب کو اس میں جگہ دی جائے، جو اس مقصد میں زیادہ سے زیادہ معین ومفید ہیں؛ تاکہ طلبا میں عربی کی صحیح اور مضبوط استعداد پیدا ہو۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ''درسِ نظامی'' کے اکثر فارغین عربی پر عبور نہیں رکھتے، یا کم از کم یہ بات ہے کہ وہ بے تکلفانہ طور پر عربی کی بول چال اور لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، ہوسکتا ہے کہ پہلے زمانے میں اس کی اس قدر ضرورت نہ رہی ہو اور جیسا کہ بعض حضرات نے کہا ہے، کہ ''درسِ نظامی'' کا اصل مقصد قرآن و حدیث کی فہم پیدا کرنے کے لیے فنی نہج پر پڑھا دینا ہو؛ مگر آج وقت اور حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ایک عالم عربی زبان میں نہ صرف فنی طور پر مہارت حاصل کرے؛ بل کہ اس کے ساتھ ساتھ تقریر وتحریر کا بھی پورا سلیقہ پیدا کرے۔

عربی زبان کی مہارت نہ ہونے کی پہلی وجہ

اور مذکورہ نظامی کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ عربی زبان پڑھانے کے لیے، جن کتابوں کو داخلِ نصاب رکھا گیا ہے، ان میں سے بنیادی کتابیں: جیسے ''میزان''، ''منشعب''، ''نحو میر'' و ''صرف میر'' وغیرہ فارسی زبان میں ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ فارسی اور عربی دونوں زبانیں، ہماری مادری زبانیں نہیں ہیں، ہم بچے کو ایک غیر

مادری و بیگانہ زبان، دوسری غیر مادری و بیگانہ زبان کے ذریعے سکھانا چاہتے ہیں، تو اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے: کسی ہندوستانی کو انگریزی زبان کی تعلیم فرانسیسی کے ذریعے دی جائے۔ اس صورت میں طالبِ علم پر دو بے گانہ زبانیں سیکھنے کا بار پڑتا ہے، جس کا نتیجہ وہی رونما ہوتا ہے اور ہونا چاہیے، کہ اصل مقصد سے طالبِ علم رہ جاتا ہے؛ لہٰذا عربی سکھانے کے لیے مادری زبان کو واسطہ ووسیلہ بنانا چاہیے۔ الحمدللہ اس سلسلے میں بعض عمدہ واچھی کتابیں منصۂ شہود پر رونما ہو چکی ہیں، جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ پھر علما نے اس کو کیوں داخل نصاب کیا؟ کیا ان کی نظر اس کی طرف نہیں گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ کتابیں نصاب میں داخل کی گئیں، وہ دَور اور اس کے بعد بھی ایک زمانے تک فارسی یہاں کی مادری زبان تھی؛ اس لیے اس وقت یہی مناسب تھا؛ لیکن جب یہ ہماری مادری زبان نہیں رہی، تو اس کو نصاب میں باقی رکھنا مفید ہونے کے بہ جائے مضر ہوگا۔

عربی پر مہارت نہ ہونے کی دوسری وجہ

اور دوسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان بنیادی کتابوں کی تعلیم میں وہ طریقہ استعمال کیا جاتا ہے، جو تخصص کے کسی شعبے یا تحقیقی ادارے کے شایانِ شان ہے، جیسے: ''کافیہ'' اور ''شرحِ جامی'' کے سبق میں ان کتابوں کے سارے اسراری مباحث، ان کے مالہ و ماعلیہ کے ساتھ اس طرح بیان کیے جاتے ہیں، کہ وہ درسِ نحو کے بہ جائے درسِ فلسفہ کہے جانے کا مستحق نظر آتا ہے اور ان میں لفظی موشگافیوں، عبارتی تعقیدات ہی کو سب کچھ اور نقطۂ عروج خیال کیا جاتا ہے۔ یہ طرزِ تعلیم مفید ہونے کے بہ جائے طالب کی استعداد میں فتور کا سبب بن جاتا ہے؛ کیوں کہ یہ

مباحث اس کی استعداد وضرورت دونوں سے آگے کی چیز ہے۔

مدارس میں ''انگریزی'' زبان کا مسئلہ

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے نصاب میں ''انگریزی'' اورصوبائی وعلاقائی زبان کو بھی ایک جزو لازم کی طرح داخل کرنے کی ضرورت ہے ،جس طرح ہمارے اسلاف نے وقت کی ضرورت کالحاظ کرتے ہوئے اس زمانے میں ''فارسی'' زبان کو داخل نصاب کیا تھا؛ کیوں کہ آج ''انگریزی'' زبان صرف ہمارے ملک ہی میں نہیں ؛ بل کہ خود ہمارے اپنوں کے گھروں میں بھی اس قدر رواج پا گئی ہے، کہ ان لوگوں کی افہام وتفہیم اوران تک اسلام کے صحیح پیغام کی دعوت، اب اسی زبان میں منحصر ہوگئی ہے، اسی طرح غیروں کے سامنے اسلام کی صحیح و سچی تصویر اوراس کے مستند پیغام کی دعوت اس کے بغیر ممکن نظر نہیں آتی ، کہ ان ہی کی زبان کو ذریعہ و وسیلہ بنایا جائے ،اسی طرح اپنی علاقائی زبان کوان ہی مقاصد کے لیے سیکھنا ایک ضرورت بن گیا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ان ہی مقاصد کے پیشِ نظر ''عبرانی'' زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا،آپ نے ان سے فرمایا تھا کہ مجھے یہود کی تحریر پراطمنان نہیں ؛اس لیے تم اس کو سیکھ لو،حضرت زید رضی اللہ عنہ نے صرف دوہفتوں میں ان کی زبان اوراس کی تحریر سیکھ لی تھی۔ (الإصابة:۲/۵۹۳)

ابن سعد رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں اس روایت کو نقل کیا ہے:

''قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم : إِنَّهُ يَأْتِيْنِيْ كُتُبٌ مِّن أُنَاسٍ لاَ أُحِبُّ أَنْ يَقْرَأَهَا أَحَدٌ، فَهَلْ تَسْتَطِيْعُ أَنْ تَعَلَّمَ الْعِبْرَانِيَّةَ ، أَوْ قَالَ:السُّرْيَانِيَّةَ ؟ فَقُلْتُ : نَعَمْ ، قَالَ: فَتَعَلَّمْتُهَا فِيْ سَبْعَ عَشَرَةَ لَيلةً''

(طبقات ابن سعد:۲/۳۵۸)

(حضرت زید کہتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ میرے پاس لوگوں کے خطوط آتے ہیں، میں پسند
نہیں کرتا، کہ کوئی ان پر مطلع ہو، کیا تم سے یہ ہو سکے گا؟ کہ عبرانی
زبان سیکھ لو، یا یہ فرمایا کہ سریانی زبان سیکھ لو۔ کہتے ہیں کہ میں نے
''ہاں'' کہا اور سترہ دنوں میں میں اس کو سیکھ لیا۔)

اگر آج ہم نے اس کی طرف توجہ نہ کی؛ تو اس کے دو نقصانات واضح ہیں: ایک تو یہ کہ ہم امت تک دین کا پیغام پہنچانے میں قاصر رہ جائیں گے، جو کہ ہماری ذمے داری ہے۔ دوسرے: یہ کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگ محض زبان دانی کی بنیاد پر دینی رہبر و قائد بن کر کھڑے ہو جائیں گے اور اپنی جہالتوں سے امت کو گمراہ کرتے رہیں گے؛ مگر علما کا طبقہ زبان نہ جاننے کی وجہ سے اس کا کوئی تدارک نہ کر پائے گا۔ چناں چہ آج بعض علاقوں میں یہ صورتِ حال بھی پیدا ہو گئی ہے، کہ بعض گمراہ یا جاہل لوگ اسلام کی دعوت و تبلیغ کے نام سے انگریزی زبان میں لوگوں کو متأثر کر رہے ہیں اور عوام الناس ان پر علما سے زیادہ اعتماد کرنے لگے ہیں؛ بل کہ اس قسم کے لوگوں کے بارے میں یہ خیال کرنے لگے ہیں، کہ یہی لوگ حقیقی معنے میں علما ہیں، جب کہ ان لوگوں کو علم و دین سے کوئی درو کار نہیں۔ یہ دراصل زبان کی طاقت ہے۔

حضرت قاسم العلوم نانوتوی رحمہ اللہ کا واقعہ

اس سلسلے میں ہو سکتا ہے کہ بہت سارے حضرات کو یہ سن کر بے حد تعجب معلوم ہو، کہ قاسم العلوم حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ نے خود ایک موقعے پر انگریزی زبان سیکھنے کا عزم فرمالیا تھا؛ مگر اس کے بعد جلد ہی وفات ہو جانے سے یہ خواہش آپ کی پوری نہیں ہو سکی۔

چناں چہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس سلسلے کی ایک دلچسپ بات وہ ہے، جسے بہ راہِ راست اس فقیر نے مولانا حافظ محمد احمد مرحوم (سابق مہتمم دار العلوم دیوبند) سے سنی تھی، اپنے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ (بانی دار العلوم) کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے، کہ آخری حج میں جب جارہے تھے، تو کپتان جہاز نے جو غالباً کوئی ''اٹالین'' تھا، عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماً وہ دیکھ رہا تھا، یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ حجاج میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے، انھوں نے کپتان سے مولانا کے حالات بیان کیے، اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی، وہاں کیا تھا، مولانا بہ خوشی کپتان سے ملے، کپتان نے اجازت چاہی، کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کرسکتا ہوں؟ مولانا نے اسے بھی منظور فرمالیا، وہی انگریزی خواں صاحب ترجمان بنے، کپتان پوچھتا تھا اور مولانا جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات کو سن کر وہ کچھ مبہوت سا ہوگیا اور مولانا کے ساتھ اس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ وہ اسلام کا اعلان کردے۔ ....اس واقعے کا مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرمالیا، کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا؛ کیوں کہ مولانا کو یہ محسوس ہورہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر بہ راہِ راست گفتگو سے پڑسکتا تھا، ترجمان کے ذریعے وہ بات نہیں حاصل ہورہی ہے؛ لیکن افسوس ہے کہ اجل

مسمیٰؒ نے واپس آنے کے بعد فرصت نہ دی۔‘‘

(بہ حوالہ ’’تاریخِ درس نظامی‘‘: ۱۴۷-۱۴۸)

جدید ’’علم الکلام‘‘ کی ضرورت

ایک اہم نصابی ضرورت ’’جدید علم الکلام‘‘ کی ہے، جس کے ذریعے طلبا میں موجودہ دور میں باطل فلسفوں کے خلاف نبرد آزمائی اور مقابلے کی صلاحیت واستعداد پیدا ہو، جس طرح ہمارے اسلاف نے ان کے زمانے کے باطل فلسفوں اور اِزموں کا رد کرنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ’’قدیم علم الکلام‘‘ کی داغ بیل ڈالی اور اس کو اپنے نصاب کا جزو بنایا تھا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ نے اسی غرض سے **’’الانتباهات المفيدة في حلّ الإشكالات الجديدة‘‘** تحریر فرمائی تھی۔

فرقِ ضالہ کا تعارف وتعاقب

اسی طرح ایک ضرورت اس کی محسوس ہوتی ہے، کہ باطل فرقوں کا اور ان کے عقائد ونظریات، مراسم وافعال کا تعارف کرایا جائے اور قرآن وحدیث اور اصول کی روشنی میں ان کے باطل عقائد ونظریات کا محققانہ واصولی جواب وبطلان بھی طلبا کے ذہن نشین کرایا جائے اور اس قسم کے اسباق کے لیے محاضرات قائم کیے جائیں اور یہ ہفتہ یا پندرہ روز میں ایک دفع بھی کافی ہوسکتا ہے۔

نصاب میں ’’سیرت وتاریخ‘‘ کا اضافہ

ایک چیز جس کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، وہ ہے: ’’سیرت وتاریخِ اسلام کا باب‘‘۔ مدارس میں اس سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر نصاب ہی نہیں ہے، حال

آں کہ اس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا اور حضرات اسلاف نے اس کی جانب خاصی توجہ دی ہے اور خود حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان واقعات اسلام کو جاننے اور اس کی تعلیم ونقل وروایت کا جو اہتمام تھا، اس سے بھی اس کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت محمد بن سعد بن ابی وقاص اپنے والد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے متعلق فرماتے ہیں:

" كَانَ أَبِي يُعَلِّمُنَا المَغَازِيَ وَالسَّرَايَا ، و يَقُولُ : يَا بني! إنَّهَا شَرَفُ آبائِكُم فلا تُضَيِّعُوا ذِكرَهَا ."

(سيرة حلبية:١/١، محمد رسول الله:١/٢٠٣)

(میرے والد ہمیں مغازی اور سرایا کی تعلیم دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اے بیٹو! یہ تمھارے آبا واجداد کا شرف ہے، تم لوگ ان کی یادداشت کو ضائع نہ کرو۔)

اور "**مختصر تاریخ دمشق**" میں اسی قول کو محمد بن سعد کے صاحب زادے اسماعیل بن محمد کی طرف ذرا سے الفاظ کے فرق کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔

(مختصر تاريخ دمشق:١/٢٠٣)

اور حضرت زین العابدین علی بن الحسین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"كُنَّا نُعَلِّمُ مَغَازِي رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم كَمَا نُعَلِّمُ السُّورَةَ مِنَ القُرآن." (البداية والنهاية:٣/٢٤٢)

(ہم مغازیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح پڑھاتے تھے، جس طرح ہم قرآن کی سورت پڑھاتے تھے۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے درس کا جو نصاب تھا، اس میں من جملہ اور امور

کے، ایک حصہ ''مغازی'' کا بھی تھا۔ حضرت ابن عباس ؓ کے شاگرد ''عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ'' رحمہ اللہ نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

'' وَلَقَدْ كَانَ يَجلِسُ يوماً ما يَذْكُرُ فِيْهِ إلاَّ الفِقْهَ وَ يَوماً التَّأوِيْلَ وَ يَوماً المَغَازِيَ وَ يَوماً الشِّعرَ و يوماً أيّامَ العَرَب .'' (طبقات ابن سعد:۲/۳۶۸)

(آپ ایک دن صرف فقہ کا، ایک دن صرف تفسیر کا، ایک دن صرف مغازی کا، ایک دن صرف شعر اور ایک دن صرف ایامِ عرب کا بیان کرتے تھے۔)

یہی نہیں! بل کہ سیر ومغازی کی تعلیم کے لیے اساتذہ کا تقرر بھی ہوتا تھا، حضرت قتادہ بن النعمان ؓ کے پوتے حضرت عاصم بن عمر رحمہ اللہ کو حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے جامع مسجد میں سیر ومغازی اور مناقب وفضائلِ صحابہ کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا تھا، جس کا ذکر ابن حجر رحمہ اللہ نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

'' كَانَ رَاوِيَةً لِلعِلْمِ وَلَهُ عِلْمٌ بِالمَغَازِيْ وَالسِّيَرِ، أمَرَهُ عُمَرُ بنُ عَبْدِ العَزِيزِ أنْ يَجْلِسَ فِي مَسجِدِ دِمَشقَ فَيُحَدِّثُ الناسَ المَغازِيَ ومَنَاقِبَ الصَّحَابَةِ فَفَعَلَ.''

(تہذیب التہذیب :۵/۴۸)

(آپ علم کے روایت کرنے والے تھے اور مغازی کا بھی آپ کو علم تھا، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ دمشق کی مسجد میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقبِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعلیم دیں۔)

الغرض سیر ومغازی کی تعلیم بھی ایک مہتم بالشان کام ہے، جس کی جانب توجہ اہلِ

مدارس کو دینا چاہیے اور اسلاف کے طریقے کے مطابق اس کا خصوصی اہتمام بھی ہونا چاہیے۔

کتابت وتحریر کی مشق

ہمارے نصاب میں ایک خاص ضرورت تعلیمِ کتابت بھی ہے، جس کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی، حال آں کہ اسلاف نے بچپن ہی سے بچوں کو اس کی مشق کرانے کی ہدایت دی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ملکِ ''شام'' کے اپنے امیروں کے نام یہ فرمان جاری فرمایا تھا:

'' وَعَلِّمُوْا صِبْيَانَكُم الكِتَابَةَ و السِّبَاحَةَ.'' (مصنف عبد الرزاق:۹/۱۹)

(اپنے بچوں کو کتابت اور تیراکی سکھاؤ۔)

اور تو اور خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا خاصا اہتمام فرمایا ہے، جس کا کچھ اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے کہ غزوۂ بدر میں جن کفار کو قیدی بنا کر لایا گیا تھا، ان میں سے بعض تو فدیہ دے کر رہا ہو گئے تھے اور جو فدیہ نہ دے سکے تھے اور لکھنے سے واقف تھے، ان کے متعلق نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طے فرمایا کہ یہ لوگ بہ طور فدیہ دس مسلمان لڑکوں کو لکھنا سکھا دیں۔

ابن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

'' كَانَ فِدَاءُ أَسَارىٰ بَدْرٍ أَرْبَعَةَ آلافٍ إلٰى مَا دُونَ ذٰلِكَ ، فَمَنْ لَمْ يَكُنْ عِندَهُ شَيْءٌ أَمَرَ أَنْ يُعَلِّمَ غِلمَانَ الأنصَارِ الكِتَابَةَ '' و في روايةٍ :'' أَنْ يُعَلِّمَ عَشرَةً مِنَ المُسْلِمِينَ الكِتَابَةَ '' . (طبقات ابن سعد:۲/۲۲)

(غزوۂ بدر کے قیدیوں کا فدیہ چار ہزار درہم اور اس سے کم
تھا، پس جس قیدی کے پاس کچھ نہیں تھا، اس کو حکم دیا گیا کہ وہ
انصار کے لڑکوں کو کتابت سکھا دے اور ایک روایت میں ہے کہ وہ
دس مسلمانوں کو کتابت سکھا دے)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کا بڑا اہتمام تھا کہ بچوں کو کتابت سکھائی جائے۔ نیز اس کی ضرورت ویسے بھی مشاہد ہے اور اسی لیے محدثین نے بھی تحسینِ خط کی ترغیب میں اپنی کتابوں میں ابواب قائم کیے ہیں، جس سے ان حضرات کے نزدیک اس کی اہمیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مضمون نگاری کی مشق

اسی کے ساتھ ایک بات یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ طلبا کو جس طرح تقریر کی مشق کرائی جاتی ہے، اسی طرح ''تحریر'' کی مشق بھی کرانی چاہیے؛ تاکہ آج صحافت کی دنیا پر جو الحاد و دہریت اور جدیدیت کا قبضہ ہو چکا ہے اور اس کی وجہ سے عوام الناس ہر وقت علما مخالف و دین مخالف تحریرات و بیانات پڑھ کر ذہناً وفکراً ان سے مرعوب و متأثر ہو جاتے اور علما و مدارس سے؛ بل کہ دین و شریعت ہی سے بے زار ہو جاتے ہیں، اس صورت حال کا تدارک کیا جا سکے۔

آج عام طور پر علما کے اس میدان سے ہٹ جانے کی وجہ سے الحاد و دہریت زدہ لوگوں کا اس پر پوری طرح راج نظر آتا ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی مناسب ہوگا کہ پروفیسر بشیر حسین جو عام طور پر ''روزنامہ سالار'' وغیرہ اخبارات میں علما مخالف و دین مخالف بیانات دینے کے

عادی تھے، انھوں نے آج سے تقریباً تیرہ چودہ سال قبل اپنے چند مضامین میں ''مسلم پرسنل لا'' اور شریعت کے احکامات پر سخت اعتراضات کیے۔ اس وقت احقر نے ''سالار اخبار'' ہی کے ذریعے ان کا کئی قسطوں میں جواب لکھا اور ''روز نامہ سالار'' نے بھی پوری اہمیت کے ساتھ اس کو شائع کیا، جب میرا یہ مضمون شائع ہوا، تو اس کے بعد وہی پروفیسر بشیر حسین نے ''سالار'' ہی میں یہ لکھا کہ ''میں سالہا سال سے اخبارات میں لکھ رہا ہوں؛ مگر یہ پہلا موقع ہے کہ کسی عالم نے میرا جواب لکھا ہو۔''

اس سے میں یہ بتانا چاہتا ہوں، کہ آج صحافت کی دنیا پر اسی قسم کے لوگوں کا تسلط ہے اور ان کا جواب بھی دینے والا کوئی نہیں، اگر بر وقت ان کا تعاقب کیا جائے؛ تو یہ ضرور میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، چناں چہ الحمد للہ میرے اس جواب کے بعد ان پروفیسر صاحب کا منہ ایسا بند ہوا کہ آج تک کھل نہیں سکا۔

نظامِ تعلیم

دوسری بات: نظامِ تعلیم کی اصلاح کے بارے میں ہے۔ آج جو نظامِ تعلیم مروج ہے، اس میں اپنی بے شمار خوبیوں کے باوجود بعض خامیاں واضح طور پر محسوس کی جاتی ہیں، جن کی اصلاح کی طرف توجہ دینا از حد ضروری ہے۔

طلبہ سے محنت کرانے کا اہتمام

ایک یہ کہ عام طور پر عربی جماعتوں میں ساری محنت اساتذہ کرتے ہیں اور مطالعہ وتحقیق کے سارے مراحل یہی حضرات طے فرماتے ہیں اور پھر اپنی علمی استعداد کے مطابق طلبا کے سامنے اپنی تحقیقات وتدقیقات کا خلاصہ اور نچوڑ پیش کر دیتے ہیں، اس کے برخلاف طالب علم: نہ مطالعہ کرتا ہے اور نہ کوئی علمی صلاحیت

پیدا کرنے کی محنت کرتا ہے اور نہ سبق ہی کا کوئی خاص اہتمام والتزام کرتا ہے، اس صورتِ حال کا جونقصان طلبا کے حق میں رونما ہوتا ہے، وہ کسی بھی ذی عقل و ہوش پر مخفی نہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ نے اپنے والد حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمہ اللہ کے متعلق لکھا ہے کہ:

> ''میرے والد صاحب مدارس کے موجودہ طرزِ تعلیم کے بہت ہی خلاف تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ اس سے استعداد نہیں بن سکتی، کہ مدرس تو رات بھر مطالعہ دیکھے اور سبق میں ساری تقریریں کرے اور طلبائے عظام کا احسان ہے، کہ وہ سنیں یا نہ سنیں، اِدھر اُدھر مشغول رہیں۔ ان کا (یعنی شیخ کے والد کا) مشہور طرزِ تعلیم یہ تھا کہ سارا بار طالبِ علم کے اوپر رہے، وہ مطالعہ دیکھے، سبق کی تقریر کرے، وہ فرماتے تھے کہ استاذ کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ''ہوں'' کرے یا ''اوہوں''۔

(آپ بیتی: ۱/۸۴)

الغرض یہ موجودہ طریق بالخصوص ابتدائی کتابوں کے لیے انتہائی مضر اور طلبا کی استعداد کے لیے سمِ قاتل ہے، ہاں! جب طالبِ علم ان ابتدائی مراحل سے گزر کر پختہ استعداد وصلاحیت کا حامل ہو جائے، تو تفسیر وحدیث اور فقہ کی بڑی کتابوں میں اس طریق سے کوئی نقصان نہیں۔

درسی تقریر میں طلبہ کی استعداد کا لحاظ

دوسری بات: یہ کہ عام طور پر درسیات میں لمبی لمبی تقریر کا رواج ہے، جو عام طور پر نفسِ مضمون اور کتاب کے مشمولات سے کوئی تعلق نہیں رکھتی؛ بل کہ محض تقریری یا

علمی استعداد و صلاحیت جتانے کے لیے پیش کی جاتی ہے اور بعض اوقات یہ بالکل عوامی ذوق کی تسکین کا سامان معلوم ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں طلبا بھی اسی کے عادی ہو جاتے اور علمی ابحاث سے دوری و بعد کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اور بعض حضرات مِدرسین کے یہاں فطرت سے بعید اور مضحکہ خیز انداز بھی دیکھنے میں آیا ہے، کہ محض اپنی قابلیت جتانے کے لیے ابتدائی کتابوں: جیسے ''نحو میر'' و ''ہدایۃ النحو'' اور ''نور الایضاح'' اور ''قدوری'' وغیرہ میں اتنی لمبی تقریریں، طویل بحثیں اور علمائے نحاۃ و فقہا کے متعدد اقوال اور ان کے اختلافات بیان کر کے طلبا کو اس کا مکلّف کیا جاتا ہے، کہ وہ اس کو یاد کریں اور سنائیں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ مبتدی طلبا، نہ ان مباحث کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان سے ان کو کوئی معتد بہ فائدہ ہے۔

اس سلسلے میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنی کتاب ''نظامِ تعلیم و تربیت'' میں ایک لطیفہ بھی ایک معقولی استاذ کا نقل کیا ہے:

> ''ایک مشہور معقولی استاذ کا قاعدہ تھا، کہ جب سبق پڑھانے بیٹھتے، تو ''تہذیب'' میں ''ملا جلال'' کی باتیں اور ''ملا جلال'' میں ''شفاء'' و ''اشارات'' کے مباحث طلبا کے سامنے بیان کیا کرتے تھے، نتیجہ یہ تھا کہ اس درجے کے طلبا کی سمجھ سے وہ اونچی باتیں باہر ہوتی تھیں؛ اس لیے طلبا جب پڑھ کر اٹھنے لگتے، تو استاذ صاحب خود ہی فرماتے کہ ''پڑھانے کو تو میں نے سب پڑھا دیا؛ لیکن میری تقریر میرے مصلے سے باہر نہیں ہوئی، گھوم گھام کر اسی میں رہ جاتی ہے۔''

(بہ حوالہ تاریخ درس نظامی: ۹۹)

رفتار ومقدارِ تعلیم میں اعتدال

تیسری بات یہ ہے کہ مدارس کے بہت سے مدرسین کا یہ عام معمول ہے، کہ سال کی ابتدا میں طول طویل ابحاث اور غیر متعلق باتوں پر زیادہ وقت صرف کر دیتے ہیں اور جب سال کا ایک اچھا خاصا وقت اس کی نظر ہو جاتا ہے، تو کتاب ختم کرنے کے لیے کتاب کا بقیہ حصہ محض سرسریت وسطحیت کے ساتھ پڑھا دیتے ہیں، جس کا عظیم نقصان یہ ہے کہ طالبینِ علوم کتاب ونصاب کے صرف ایک مختصر سے حصے سے واقف ہوتے ہیں اور باقی ابحاث ومسائل ان کے لیے بالکل اجنبی ہوتے ہیں؛ لہٰذا غیر ضروری اور منتہی طلبا کے لائق ابحاث ومسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے نصاب یا کتاب کے کم از کم اکثر ومعتد بہ حصے سے طالبین کو خوب اچھی طرح واقف کرادینے کا پورا پورا اہتمام ہونا چاہیے اور اس کے لیے مقدارِ تعلیم اور رفتارِ تعلیم میں اعتدال رکھنے کی ضرورت ہے۔

نصاب کے تمام ابواب سے طلبہ کو روشناس کرانے کی ضرورت

چوتھی بات: یہ ہے کہ مدارس میں جو نصاب مقرر کیا گیا ہے، اس میں ایک ہی فن کی متعدد کتب کی تدریس میں ایک بہت ہی سنگین غلطی یہ ہوتی ہے، کہ ان میں سے ہر کتاب کا ابتدائی حصہ پڑھایا جاتا ہے اور عموماً اس کا درمیانی وآخری حصہ اور بعض جگہ آخری حصہ متروک ہو جاتا ہے، خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو؛ لیکن اس کا نقصان شدید ہے؛ کیوں کہ اس سے یہ ہوتا ہے کہ طلبا ہر فن کے ابتدائی مسائل ومضامین یا ہر کتاب کے صرف شروع کے ابواب سے واقف ہوتے ہیں اور بعد کے مضامین و ابواب سے بالکل کورے ونا کارہ ونا واقف ہوتے ہیں۔

مثلاً فقہ کی کتابوں میں سے ہر کتاب میں طالبین کو ''کتاب الطہارت'' سے

''کتاب النکاح'' یا اس سے کچھ آگے تک کے ابواب پڑھا دیے جاتے ہیں؛ مگر ''کتاب البیوع''، ''کتاب الاجارۃ''، ''کتاب الشفعۃ'' اور ''کتاب القضا'' وغیرہ بہت سے اہم ابواب بالکل نہیں پڑھائے جاتے ،جس کے نتیجے میں طلبا ان ابواب کی حقیقت تو دور کی بات ہے،ان کے ناموں تک سے ناواقف ہوتے ہیں؛ بل کہ مزید یہ کہ یہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی عموماً ان سے ناواقف ہی رہ جاتے ہیں۔

اس پر ایک دلچسپ لطیفہ یاد آ گیا ، کہ ایک مرتبہ ایک مولانا میرے پاس آئے اور بات چیت کے دوران کہا کہ مسجد سے قرآن چرانا جائز ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ اس میں کیا اشکال ہے؟ یہ مسئلہ تو بالکل واضح ہے کہ چوری حرام و ناجائز ہے۔تو کہنے لگے کہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ'' دار العلوم'' میں پڑھتے وقت یہ مسئلہ درسِ ''ہدایہ'' میں آیا تھا کہ مسجد سے قرآن کی چوری جائز ہے۔

''ہدایہ'' میرے سامنے ہی رکھی ہوئی تھی، میں نے کہا کہ یہ لیجیے ''ہدایہ''! اس میں تلاش کیجیے! اگر مل گیا؛ تو چوری کی بڑی اچھی دلیل ہاتھ آ جائے گی۔ یہ کہہ کر میں ان کو دیکھتا ہوا بیٹھا رہا اور وہ ''ہدایہ'' کے اوراق اُلٹ پلٹ کرنے لگے، کچھ دیر کے بعد ایک صفحہ پر ان کی نگاہیں جم گئیں اور وہ بڑے غور سے مطالعہ کرنے لگے،تو میں سمجھا کہ شاید کچھ مل گیا ہو؛ لہٰذا میں جو ان کے قریب بازو ہی بیٹھا ہوا تھا، کتاب میں جھانک کر دیکھا،تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ ''کتاب الحج'' کے ''باب القِران'' کو پڑھ رہے تھے۔ میں نے کہا کیا پڑھ رہے ہیں؟ تو فرماتے ہیں کہ میں '' باب القُرآن '' دیکھ رہا ہوں کہ شاید اس میں وہ مسئلہ مل جائے۔ میں نے کہا کہ ''لاحول ولاقوۃ''!! یہ تو'' باب القُرآن ''نہیں؛ بل کہ '' باب القِران'' ہے، جو''کتاب الحج'' کا ایک باب ہے،اس میں وہ مسئلہ آپ کو کیسے مل جائے گا؟

اس واقعے سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ، کہ اگر طلبا کو تمام ابواب سے

واقف نہیں کرایا جائے گا، تو ان کا یہی حال ہوگا کہ وہ ابواب کے نام بھی صحیح نہیں بتاسکیں گے۔

تعلیم کے لیے اچھے طلبہ کا انتخاب

ایک بات یہ ہے کہ آج عام طور پر مدارس میں ہر قسم کے طلبا کا بلا کسی امتیاز کے داخلہ بھی لے لیا جاتا ہے، یہ نہیں دیکھا جاتا کہ طالبِ علم داخلہ کے لائق بھی ہے یا نہیں؟ اور مزاج میں سلامتی بھی ہے یا نہیں؟ اسی طرح ہر طالبِ علم کو ہر قسم کی تعلیم اس کے حسبِ طلب دے دی جاتی ہے اور یہ بات قطعاً نہیں دیکھی جاتی ، کہ اس کی مانگ کے مطابق تعلیم دیے جانے کے یہ قابل بھی ہے یا نہیں؟

اس صورتِ حال کے دو نتیجے سامنے آرہے ہیں: ایک تو یہ کہ اگر طالبِ علم بالکل ناکارہ ہوتا ہے اور مزاج میں شر ہوتا ہے، تو ایسے لوگ تعلیم پانے کے بعد امت کے حق میں مفید بننے کے بہ جائے مضر اور دین اسلام کے داعی بننے کے برخلاف دین کے لیے ایک بدنما داغ بن جاتے ہیں اور دوسرا: یہ کہ اساتذہ کی اکثر محنت رائیگاں اور ضائع جاتی ہے، محض نام ہو جاتا ہے، کہ فلاں مدرسے میں اتنے اور فلاں میں اتنے طلبا پڑھتے ہیں، جب کہ ان میں سے بیشتر محض پڑے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم (محدث دارالعلوم دیوبند) فرمایا کرتے ہیں کہ مدارس میں بعض طلبہ تو پڑھنے آتے ہیں اور بہت سے تو پڑے رہنے کے لیے آتے ہیں۔

لہٰذا مدارس کو امت کے حق میں زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے لیے ضروری ہے کہ محض طلبا کی کثرت کا لحاظ نہ کیا جائے؛ بل کہ عمدہ اور بہتر طلبا کا انتخاب کرنے کی ممکنہ کوشش کی جائے۔

اس سلسلے میں ہمارے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ وائمہ کے یہ اقوال رہنمائی کے لیے کافی ہیں:

(ا) حضرت انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

"لا تَطْرَحُوا الدُّرَّ فِي أَفْوَاهِ الْكِلَابِ" (المحدث الفاصل:۱/۴/۵۷)

(کتوں کے منہ میں موتی نہ ڈالو۔)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ کی مراد اس سے "فقہ" ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"أَكْثِرُوا الْعلمَ ولا تَضعُوه فِي غَيْرِ أَهْلِه كَقَاذِفِ اللُّؤلؤِ إلى الْخنَازِيرِ." (المحدث الفاصل:۱/۴/۵۷)

(علم زیادہ کرو، مگر اس کو خنزیر کی طرف موتی پھینکنے والے کی طرح نااہل کے پاس نہ رکھو)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور فرمایا:

"يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ! لاَ تَتَكَلَّمُوا بِالْحِكْمَةِ عِنْدَ الْجُهَّالِ فَتَظْلِمُوهَا، وَلاَ تَضَعُوهَا عِنْدَ غَيْرِ أَهْلِهَا فَتَكْتُمُوهَا." (الإلماع:۱/۲۳۳)

(اے بنی اسرائیل! حکمت کی بات جاہلوں کے سامنے بیان نہ کرو! کیوں کہ اس سے تم اس کو گھٹا دو گے اور نااہل کے پاس یہ نہ رکھو، کہ تم اس کو چھپا دو گے۔)

امام زہری رحمہ اللہ نے فرمایا:

"إِنَّ لِلحَدِيثِ آفَةً وَنَكَداً وهُجْنةً، فآفته نِسيَانُهُ

وَنَكُدُه الكَذِبُ وهُجُنته نَشرُه عِنْدَ غَيرِ أَهْلِه"

(الإلماع:۱/۲۱۹،المحدث الفاصل:۱/۵۷)

(حدیث کے لیے ایک آفت اور ایک کمی اور ایک بربادی ہے: آفت تو اس کو بھولنا ہے اور کمی اس میں جھوٹ کہنا ہے اور اس کی بربادی، اس کو نا اہل کے سامنے پیش کرنا ہے۔)

امام اعمش رحمہ اللہ کہتے ہیں:

" آفَةُ الحَدِيْثِ النِّسيَانُ وَ إضَاعَتُهُ أَنْ تُحَدِّث بِهِ غَيْرَ أَهْلِه ." (المحدث الفاصل:۱/۴/۵۷)

(حدیث کے لیے آفت بھول ہے اور اسکو ضائع کرنا یہ ہے کہ نا اہل سے بیان کی جائے۔)

امام ابوجعفر رحمہ اللہ نے اپنے شاگرد حضرت جابر کو نصیحت کی کہ:

" يا جَابِرُ! لا تَنْشُرِ الدُّرَّ بَيْنَ أَرْجُلِ الخَنَازِيْرِ ، فَإنَّهُم لا يَصْنَعُونَ بِه شَيْئاً ، وَ ذَلِكَ نَشْرُ العِلْمِ عِنْدَ مَن لَيْسَ لَهُ بِأَهْل." (المحدث الفاصل:۱/۴/۵۷)

(اے جابر! موتی خنزیر کے قدموں میں نہ پھیلا؛ کیوں کہ یہ اس سے کچھ نہیں کر سکتے اور اس سے مراد نا اہل کے سامنے علم کا نشر کرنا ہے۔)

امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا:

" لا تَنْثُرِ اللُّؤلُؤَ عَلى أظْلافِ الخَنَازِير يعني الحديث."

(لؤلؤ اور موتی یعنی حدیث کا علم، خنزیر کے قدموں میں نہ ڈالو)

ایک روایت میں یوں فرمایا:

" اُنْظُرُوا إِلٰى هٰذِهِ الدَّنَانِيرِ ، لَا تُلْقُوهَا عَلَى الكَنَايِس يعني الحديث " (المحدث الفاصل:۱/۴/۵۷)

(ان دیناروں کو دیکھو، انھیں کوڑے دانوں میں نہ ڈالنا۔)

اسی سلسلے کا یہ واقعہ بڑا دلچسپ ہے:

" امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام شعبی رحمہ اللہ نے مجھ سے اس گدھے کے بارے میں حدیث بیان کی، جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہا، جب میں نے یہ حدیث بیان کی، تو میرے سے سننے والوں میں سے بعض امام شعبی رحمہ اللہ کے پاس اس کی تحقیق کے لیے آئے اور ان سے اس کے بارے میں پوچھا تو امام شعبی نے کہا: "مَا حَدَّثْتُ بِهٰذَا الحَدِيثِ قَطّ"، (میں نے تو کبھی یہ حدیث بیان ہی نہیں کی) اب وہ لوگ میرے پاس آئے اور امام شعبی کی بات نقل کی اور پھر میں ان کے پاس گیا اور پوچھا، کہ کیا آپ نے یہ حدیث مجھ سے بیان نہیں کی تھی؟ تو آپ نے فرمایا: " أُحَدِّثُكَ بِحَدِيثِ الحُكَمَاءِ وَ تُحَدِّثُ بِهِ السُّفَهَاءَ؟ (میں تو تمھیں حکما کی حدیث سناؤں اور تم اس کو لے جا کر بے وقوفوں سے بیان کرو۔)

(الجامع لأخلاق الراوي:۱/۳۳۵، المحدث الفاصل:۱/۵۷)

ان سب اقوال سے یہ بات واضح ہوتی ہے، کہ علم دین پڑھانے کے لیے طلبا کا انتخاب نہایت ضروری ہے؛ ورنہ علم ضائع ہوگا اور امت اس سے فتنے میں مبتلا ہوگی، جیسا کہ مشاہد ہے۔

مدارس میں دوقسم کا نصاب ہونا چاہیے

لہٰذا مدارس میں دوقسم کا نصاب ہونا چاہیے: ایک اصلاحی وتربیتی نصاب، جو ہر طالب کے لیے مفید ہوسکتا ہے؛ تا کہ اس کی اصلاح ہو اور وہ ایک اچھا اور دین دار مسلمان بن جائے اور اس کے بعد وہ اپنے دنیوی کاموں میں لگ جائے اور دوسرا نصاب: وہ جو عام طور پر مدارس میں رائج ہے، جس کو پڑھ کر ایک شخص عالمِ دین اور ملت کا رہنما بنتا ہے، یہ نصاب ذہین وفطین اور شریف ونیک طبع طلبا کے لیے خاص ہو۔

تبدیلئ مدرسہ تصدیق

اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے، کہ عام طور پر ہمارے مدارس میں طلبا کے ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے کو منتقلی کے لیے ''تصدیق'' کا رواج نہیں ہے، جس کا نقصان یہ ہے کہ نا اہل و نا کارہ اور بد مزاج وشریر طلبا ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے کو جب چاہتے ہیں، منتقل ہوتے رہتے ہیں، اگر ایک مدرسے میں ان کی تعلیم یا اصلاح کے لیے ان پر سختی کی گئی، تو فوراً وہاں سے راہِ فرار اختیار کرتے اور دوسرے مدرسے میں بہ آسانی داخلہ لے لیتے ہیں اور مزید یہ کہ دوسرے مدرسے میں وہ اپنا کوئی قصور نہیں بتاتے؛ بل کہ سابق مدرسے کا قصور بتا کر داخلہ لیتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی عمر بھر نہ تعلیمی لیاقت ہی درست ہوتی ہے اور نہ اصلاح ہی ہوتی ہے، اسی طرح وہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہوتے ہوتے فارغ التحصیل بھی ہو جاتے ہیں اور اپنی تعلیمی کمزوریوں کو باقی رکھتے ہوئے ''عالم وفاضل'' کی سند پا لیتے ہیں۔

یہ صورتِ حال جس طرح طالبِ علم کے حق میں نقصان دہ ہے، اسی طرح مدارس کے حق میں بھی سخت مضر ہے؛ لہٰذا یہ مناسب ہے کہ اہلِ مدارس کسی بھی مدرسے سے آنے والے طالب علم سے تصدیق کا مطالبہ کریں؛ ورنہ اس کا داخلہ نہ

لیں اور اس کو اپنے من جملہ اصول کے ایک اصول قرار دیں؛ تا کہ طالبِ علم کا بھی بھلا ہو اور مدرسے بھی نقصان کی زد سے محفوظ رہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور پہلو بھی قابلِ لحاظ ہے: وہ یہ کہ اگر طالبِ علم کو کوئی واقعی عذر ہو اور وہ ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے میں منتقل ہونا چاہے، تو اس سلسلے میں بھی اعذار کی تصدیق کے بعد مدرسے والوں کو بہ خوشی وفراخ دلی تصدیق دے دینا چاہیے؛ تا کہ وہ اپنی تعلیم کو جاری رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہ پائے۔ بعض اہلِ مدارس اس سلسلے میں بخل سے کام لیتے ہیں، جو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

نظامِ تربیت

تعلیم کے بعد مدارسِ اسلامیہ کے تربیتی نظام کے متعلق اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

یہ بات ہر شبہے سے بالاتر ہے، کہ مدارس کا قیام محض تعلیم کے لیے نہیں ہے؛ بل کہ تعلیم کے ساتھ ان کا اس سے بھی اونچا مقصد طلبا کی ذہنی وفکری اصلاح، عملی و اخلاقی تربیت بھی ہے؛ اس لیے یوں کہا جا سکتا ہے، کہ مدارس دو کاموں کے ذمے دار ہیں: ایک یہ کہ طلبا میں صلاحیت پیدا کریں اور دوسرے یہ کہ ان میں صالحیت پیدا کریں؛ لہٰذا مدارس کا کام عام اسکولوں اور کالجوں کے لحاظ سے بڑا بھی ہے اور بڑھا ہوا بھی ہے۔

اگر چہ مدارس کی فضا اور وہاں کا ماحول ہر وارد و صادر کے لیے ''روحانیت ونورانیت'' کا سبق و درس دیتا ہے؛ لیکن اس میں کیا شک ہے کہ اس سبق و درس سے فائدہ وہی لوگ اُٹھاتے ہیں، جو اپنی سرشت میں خیر؛ فطرت میں نیکی اور مزاج میں اعتدال کی خوبیوں کے حامل ہوتے ہیں؛ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس ماحول

میں پلنے والے طلبا کا مزاج وطبیعت بنانے کی بھی فکر کی جائے۔

مدرسے کی حقیقت

یہاں حضرت اقدس عالم ربانی مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ کا ایک بیان نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، جو مدرسوں کی حقیقت واصلیت اور اسی کے ساتھ ان کے کام وطریقِ کار پر پوری طرح روشنی ڈالتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"میں مدرسے کو پڑھنے پڑھانے اور پڑھا لکھا انسان بنانے کا کارخانہ نہیں سمجھتا، میں مدرسے کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے تیار نہیں ہوں، میں اس سطح پر آنے کو تیار نہیں ہوں، کہ مدرسہ اسی طریقے سے پڑھنا لکھنا سکھانے یا یوں کہنا چاہیے کہ پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کا ایک مرکز ہے۔ جیسے کہ دوسرے اسکول اور کالج ہیں۔ میں اس کو مدرسے کے لیے ازالۂ حیثیت عرفی کے مرادف سمجھتا ہوں، یعنی اگر میں مدرسے کا وکیل ہوں یا میں خود مدرسہ بن جاؤں، تو میں اس پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ قائم کرسکتا ہوں، اگر کوئی مدرسے کو صرف اتنا حق دینے اور مدرسے کو صرف اتنا ماننے کے لیے تیار ہے کہ "صاحب! جیسے پڑھنے لکھنے کا، ہنر سکھانے کے لیے بہت سے کارخانے ہیں، بہت سے مرکز ہیں، کوئی "اسکول" کہلاتے ہیں، کوئی "کالج" کہلاتے ہیں، ان کے مختلف معیار اور مختلف سطحیں ہیں، اسی طریقے سے "مدرسے" بھی عربی زبان یا عربی فنون، فقہ اور دینیات، تفسیر یا حدیث سکھانے کا ایک مرکز یا کارخانہ ہے۔

میں مدرسہ کو نائبینِ رسول وخلافتِ الٰہی کا فرض انجام دینے والے اور انسانیت کو ہدایت کا پیغام دینے والے اور انسانیت کو اپنے تحفظ وبقا کا راستہ دکھانے والے افراد پیدا کرنے والوں کا ایک مرکز سمجھتا ہوں، میں مدرسے کو آدم گری اور مردم سازی کا ایک کارخانہ سمجھتا ہوں۔" (بہ حوالہ میر کارواں:۱۷۲)

الغرض دینی مدارس: عام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طرح نہیں ہیں، کہ محض کچھ لکھنے پڑھنے کی قابلیت پیدا کردی جائے؛ بل کہ ان کا مقصد اس سے بہت اونچا ہے، جیسا کہ ملاحظہ کیا گیا؛ ورنہ تربیت کے بغیر محض تعلیم، تو نقصان دہ ہے۔ اس سلسلے میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے چند ارشادات بھی سننے کے قابل ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"اگر کتابی علم کامل ہو اور تربیت نہ ہو؛ تو چالاکی اور دھوکہ دہی کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے، علم بدون تربیت مورث عیاری ہے، نرے پڑھنے پڑھانے سے کیا ہوتا ہے، نرا علم شیطان اور "بلعام باعور" کا سا ہے، درخت خودرو کہیں ٹھیک نہیں ہوتا، ناہموار اور بعض اوقات بدمزہ رہتا ہے، جب تک باغباں درست نہ کرے، کاٹ چھانٹ نہ کرے، قلم نہ لگاوے۔ ایسے ہی وہ شخص جو محض کتابوں کے پڑھ لینے کو کافی سمجھ بیٹھے، اس کی مثال بعینہٖ درخت خودرو کی سی ہے، جب تک اسے کوئی مربی درست نہ کرے، تب تک ٹھیک نہیں ہوتا؛ بل کہ بد دین اور بدعقائد یا بداخلاق ہوجاتا ہے۔

(طریق النجاۃ ومقالاتِ حکمت:۴۰۷)

بہ ہر حال یہ معلوم ہوا کہ مدارس میں تعلیم کے ساتھ تربیت کا خصوصی اہتمام

ضروری ہے، اس سلسلے میں جن باتوں کی جانب توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے، ان میں سے بعض اہم امور کی نشاندہی پر اکتفاء کرتا ہوں:

اخلاص کی ضرورت

طلبہ کی تربیت کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے، کہ انھیں اخلاصِ نیت کی تعلیم دی جائے۔ حدیث: "**إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ**" سب ہی کے پیشِ نظر ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کی ابتدا اسی حدیث سے فرماتے ہوئے اس طرف رہنمائی کی ہے، کہ ہر طالب کو سب سے پہلے اپنی نیت کو درست کر لینا چاہیے۔

قاضی ابن جماعہ رحمہ اللہ نے طالب علموں کے لیے اخلاص وللّٰہیت کی ضرورت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "طالبِ علم کے لیے علم کی طلب میں دوسری شرط: خلوصِ نیت ہے، یعنی علم کے حاصل کرنے کا مقصد خداوندِ تعالیٰ کی خوشنودی کی جستجو، اس کے حکموں پر عمل اور شریعت کو زندہ، دل کو روشن اور باطن کو اُجاگر کرنا ہے۔ (تذکرۃ السامع:۳۴)

صاحبِ ہدایہ کے شاگرد علامہ زرنوجی رحمہ اللہ اپنی مشہور عالم کتاب "**تعلیم المتعلم**" میں لکھتے ہیں:

> "طالبِ علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحصیلِ علم سے رضائے الٰہی اور طلبِ آخرت، ازالۂ جہل اور احیائے دین کی نیت کرے۔"
> (تعلیم المتعلم:۱۴)

قاضی ابن جماعہ رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے، جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں:

> "لوگو! اپنے علم سے صرف رضائے الٰہی حاصل کرنے کی

نیت رکھو، میں جب کبھی کسی مجلس میں اس نیت سے بیٹھا، کہ خاکسار اور متواضع رہوں گا، تو ہمیشہ اس مجلس سے سر بلند ہوکر اٹھا اور جب کبھی میری نیت میں فتور آیا اور ہم چشموں میں سر بلند ہونے کا تصور دل میں آیا، تو مجھے اس مجلس سے رسوا ہوکر اٹھنا پڑا۔
(تذکرۃ السامع:۳۴)

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"إنما يُطْلَبُ الْحَدِيْثُ لِيُتَّقٰى به اللّٰهَ، فلِذٰلِک فُضِّلَ عَلَى غَيرِهِ مِنَ العُلُوْمِ ، وَلَوْ لاَ ذٰلِکَ كَانَ كَسَائِرِ الأشْيَاءِ." (جامع بیان العلم:۱/۲۳۴)

(حدیث اس لیے حاصل کی جاتی ہے؛ تاکہ اس کے ذریعے اللہ سے ڈرا جائے اور اسی وجہ سے اس کو دیگر علوم پر فضیلت عطا کی گئی ہے، اگر یہ بات نہ ہو؛ تو وہ اور چیزوں کی طرح ایک چیز ہے۔)

اور حضرت حماد بن سلمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مَنْ طَلَبَ الْحَدِيْثَ لِغَيْرِ اللّٰهِ مَكَرَ بِهِ."
(جامع بیان العلم:۱/۲۳۴)

(جو غیر اللہ کے لیے حدیث کا علم حاصل کرے؛ اللہ اس کے ساتھ مکر کرتے ہیں، یعنی اللہ کی جانب سے اس کو ڈھیل دی جاتی ہے۔)

اور حضرت ابراہیم تیمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مَنْ طَلَبَ العِلْمَ لِلّٰهِ ل أعْطَاهُ اللّٰهُ مِنْهُ مَا يَكْفِيْهِ."
(جامع بیان العلم:۱/۲۳۴)

(جو اللہ کے لیے علم حاصل کرتا ہے؛ اللہ تعالیٰ اس کو اس سے وہ چیز عطا کرتے ہیں، جو اس کے لیے کافی ہو۔)

الغرض طلبا کی اصلاح وتربیت کا آغاز ہی اس بات سے ہونا چاہیے، کہ وہ سب سے پہلے اپنی نیتوں کو خالص کریں اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے علم کی طلب وتحصیل میں لگیں۔

اپنے منصب کا شعور

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ طالبِ علم کو اس کی ذمے داری اور فرائضِ منصب سے آگاہ کیا جائے؛ تاکہ اپنے منصب کی ذمے داری کا شعور پیدا ہو اور وہ اپنی ذمے داری پوری کرنے کے لیے ابھی سے تیار ہو سکے۔

یہ بات واضح ہے کہ طلبِ علم کی راہ سے طالبِ علم اہلِ علم میں شامل و داخل ہوتا ہے، لہٰذا اس کی ذمے داری دراصل اہلِ علم کی ذمے داری ہے اور علما وارثینِ انبیا ہیں؛ لہٰذا ان کے ذمے وہی سب کچھ ہے، جو انبیا علیہم الصلاۃ والسلام کے ذمے تھا۔

لہٰذا سب سے اول خود کو علم کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کے بعد ایک طالبِ علم کی ذمے داریوں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) دینِ اسلام وشریعت کی پوری طرح حفاظت کرے، اس میں کوئی ترمیم وتحریف کو کسی طرح برداشت نہ کرے۔

(۲) دین کی اشاعت وتبلیغ کرے اور دین وشریعت کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے اور اس کی دعوت کو عام کرنے کی راہیں بنائے۔

(۳) امت کے اندر دینی شعور واصلاحی جذبہ بیدار کرے؛ تاکہ وہ کج روی کے بہ جائے صراطِ مستقیم پر گامزن رہے۔

(۴) امت کو راہِ راست پر رکھنے کی بھرپور جد وجہد کرے؛ تاکہ عقائد واعمال، اخلاق وکردار، معاشرت ومعاملات سب میں وہ شریعت کے دائرے میں رہے؛ لہٰذا قرآن وسنت کی تعلیم، ان کے نفوس کے تزکیے اور قلوب کے تصفیے کی فکر میں لگا رہے۔

اوران سب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمہ وقت وہ ہدایت کے کاموں میں لگا رہے اور اس کے ہر قول وعمل سے پیغام ہدایت جاری ہو۔

ان سب ذمے داریوں کا ذکر درج ذیل آیات میں ہے:

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی :

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ. ﴾ (المائدۃ: ٤٤)

(بلا شبہ ہم نے توارت نازل کی، جس میں ہدایت ونور ہے، اس کے یہود کو موافق حکم دیتے ہیں، انبیا جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور علما ومشائخ؛ کیوں کہ ان کو اللہ کی کتاب کی حفاظت کا ذمہ دیا گیا تھا اور وہ اس پر نگران تھے۔)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے:

''یعنی یہ انبیا اور ان کے دونوں قسم کے نائبین علما و مشائخ تورات کے احکام جاری کرنے کے پابند اس لیے تھے، کہ اللہ تعالیٰ نے تورات کی حفاظت ان کے ذمے لگادی تھی اور انھوں نے اس کی حفاظت کا عہد و پیمان کیا تھا۔'' (معارف القرآن: ۱۶۰/۳)

اس میں وارثینِ انبیا، علما ومشائخ کی ایک اہم ذمے داری کا بیان ہے اور وہ ہے: کتاب اللہ کی حفاظت اور اسی میں دین وشریعت کی حفاظت کا بیان آ گیا۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی :

﴿ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ﴿ (المائدۃ: ۶۲-۶۳)

(اور آپ ان میں سے بہت سوں کو دیکھیں گے، کہ گناہ اور ظلم اور حرام کھانے میں آگے بڑھتے ہیں، پس برا ہے، وہ کام جو یہ کر رہے ہیں؛ کیوں نہیں ان کے علما ومشائخ ان کو گناہ اور حرام کھانے سے منع کرتے؟ برا ہے! جو یہ کرتے ہیں!۔)

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''اس آیت سے معلوم ہوا کہ ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کی اصل ذمے داری ان دو طبقوں پر ہے: ایک مشائخ۔ دوسرے: علما۔ اور اس میں آخر میں فرمایا: '' **لبئس ما کانوا یصنعون**'' یعنی علما ومشائخ کی یہ سخت بری عادت ہے کہ اپنا فرض منصبی ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' چھوڑ بیٹھے، قوم کو ہلاکت کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں۔)

نیز لکھا:

جس قوم کے لوگ جرائم اور گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کے مشائخ وعلما کو یہ بھی اندازہ ہو، کہ ہم ان کو روکیں گے؛ تو یہ باز آجائیں گے۔ ایسے حالات میں اگر یہ کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے ان جرائم اور گناہوں کو نہیں روکتے؛ تو ان کا جرم اصل مجرموں، بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ اشد ہے؛ اسی لیے ابن عباس رضی اللہ عنہ

نے فرمایا: ''مشائخ وعلما کے لیے پورے قرآن میں اس آیت سے زیادہ سخت تنبیہ کہیں نہیں'' اور امامِ تفسیر حضرت ضحاک سے فرمایا کہ میرے نزدیک علما ومشائخ کے لیے یہ آیت سب سے زیادہ خوفناک ہے۔ (معارف القرآن:۳/۱۸۵-۱۸۶)

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ (السجدۃ :۲۴)

(اور ہم نے ان میں امام بنائے، جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت دیتے تھے، جب کہ انھوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین کرتے تھے۔)

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (آل عمران :۱۶۴)

اس آیت میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی کا بیان ہے، لہٰذا یہی سب کچھ علما کی ذمے داریوں میں بھی شامل ہوگا۔

الغرض طالبِ علم کے سامنے یہ بات واضح ہونا چاہیے، کہ اس کو پڑھنے کے بعد کیا کام کرنا ہے؟ اس کی ذمے داریاں کیا ہیں؟

علما کی ذمے داریاں

مذکورہ امور کی کچھ تفصیل وتشریح حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کے ایک بیان سے ہوتی ہے؛ لہٰذا یہاں اس کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضرت

نے فرمایا:

''شاید انسانوں کی کوئی جماعت اتنی مشغول اور فرائض وذمے داریوں سے اتنی گراں بار نہیں، جتنی نائبانِ رسول اور علماو مصلحینِ اسلام کی جماعت ہے، جسمانی امراض کے طبیبوں کو بھی آرام اور فرصت کا موقع میسر آجاتا ہوگا؛ لیکن ان اطبائے روح کے لیے کوئی موسم، اعتدال وصحت کا نہیں؛ لیکن علمائے حق اور ﴿ قَوّٰامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ﴾ (اللہ کے لیے کھڑی ہو جانے والی اور انصاف کی گواہ) جماعت کا کام بعض مرتبہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں ختم ہونے کے بہ جائے کچھ بڑھ ہی جاتا ہے۔ کچھ چیزیں ہیں، جو حکومت وطاقت و دولت وفراغت ہی کے زمانے میں پیدا ہوتی ہیں اور علمائے اسلام ہی کا فرض ہوتا ہے، کہ ان کی نگرانی کریں، وہ اپنے فریضۂ احتساب، نگرانی، اخلاقی اور دینی رہنما کے منصب سے سبکدوش نہیں ہوتے۔ اس وقت بھی ان کا جہاد اور ان کی جدوجہد، جاری رہتی ہے۔

کہیں مسلمانوں کی مسرفانہ زندگی پر روک ٹوک کر رہے ہیں؛ کہیں سامانِ عیش وغفلت پر ان کی طرف سے قدغن ہے؛ کہیں چوری کی شراب کو گرفتار کیا ہے اور اس کو انڈیل رہے ہیں؛ کہیں باجوں اور موسیقی کے آلات کو توڑ رہے ہیں؛ کہیں مردوں کے لیے ریشم کے لباس اور سونے چاندی کے برتنوں کے استعمال پر چیں بہ جبیں ہیں؛ کہیں بے حجابی، مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط پر معترض ہیں؛ کہیں حماموں کی بے قاعدگیوں اور

بداخلاقیوں کے خلاف آواز بلند کررہے ہیں؛ کہیں غیر مسلموں اور عجمیوں کی عادات اور خصوصیات اختیار کرنے پر ان کی طرف سے مخالفت ہے؛ کبھی مسجدوں کے صحن اور مدرسوں کے ایوانوں میں حدیث کا درس دے رہے ہیں اور قال اللہ وقال الرسول کی صدا بلند کررہے ہیں اور کبھی خانقاہوں میں یا اپنے گھروں اور مسجدوں میں بیٹھے ہوئے دلوں کا زنگ دور کررہے ہیں؛ اللہ کی محبت وطاعت کا شوق پیدا کررہے ہیں؛ امراضِ قلب، حسد، تکبر، حرصِ دنیا، دوسرے نفسانی وروحانی امراض کا علاج کررہے ہیں؛ کبھی منبر پر کھڑے ہوئے جہاد کا شوق دلا رہے ہیں اور اسلام کی سرحدوں کی حفاظت یا اسلامی فتوحات کے لیے آمادہ کررہے ہیں۔

پوری اسلامی تاریخ میں آپ کو زندہ اور ربانی علما، جو حکومتِ وقت کے دامن سے وابستہ نہیں تھے، یا حقیر جھگڑوں میں مشغول نہیں تھے، ان ہی مشاغل میں منہمک نظر آئیں گے اور مسلمانوں کا کوئی دور حکومت ان علمائے حق اور ان کی جدوجہد سے خالی نہیں رہا۔''

(خطباتِ علی میاں رحمہ اللہ: ۶/۲۲۳-۲۲۴)

عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ مدارس کے بہت سے طلبا کو ان کا مقصد حیات ومنشائے تعلیم کا کوئی علم نہیں ہوتا اور وہ بس یوں ہی پڑھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو اس کام کے لیے تیار نہیں کرپاتے، جو ان کا نصب العین اور ان کی ذمے داری ہے؛ اس لیے وقتاً فوقتاً اس کا تذکرہ اور اس کے افہام وتفہیم کا سلسلہ رہنا چاہیے۔

اصلاحِ ظاہر وباطن کی فکر

طلبہ کی تربیت کا بہت ہی اہم پہلو، ان کے ظاہر وباطن کی اصلاح ونگرانی سے

متعلق ہے؛ کیوں کہ یہی مقصود بالعلم ہے، اگر یہ نہ ہو؛ تو علم کا کوئی فائدہ ہی نہیں؛ اسی لیے سلفِ صالحین نے اس سلسلے میں بڑی توجہ فرمائی ہے۔

حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اپنی کتاب **"الإلماع إلى معرفة أصول الرواية والسماع"** میں اپنی سند سے حضرت امام زہری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل فرمایا:

"إن هذا العلم أدب الله الذي أدّب به نبيّه — عليه السلام — و أدّب به نبيُّه أمتَه." (الإلماع:۱/۲۱۳)

(یہ علم اللہ کی طرف سے ایک ادب ہے، جس کے ذریعے اللہ نے اپنے نبی کو ادب سکھایا اور نبی علیہ السلام نے اپنی امت کو ادب سکھایا۔)

حضرت حبیب بن شہید رحمہ اللہ اپنے صاحب زادے سے فرماتے ہیں:

"بیٹا! حصولِ علم کے ساتھ صحبتِ علما وفقہا اختیار کر، ان سے تعلیم حاصل کر، تہذیب اور ادب سیکھ، یہ میرے نزدیک حدیث کے زیادہ علم سے بہتر ہے۔" (تذكرة السامع:۴)

نیز لکھا ہے کہ بعض علما نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی:

" يا بني ! لأن تتعلّم باباً من الأدَب أحَبُّ إليّ مِن أن تتعلّم سبعين باباً من أبواب العلم."

(اے بیٹے! تو ادب کا ایک باب حاصل کرے، یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے، کہ تو علم کے ستر ابواب حاصل کرے۔)

(تذكرة السامع والمتكلم:۴)

ابن سیرین رحمہ اللہ اپنے اسلاف اور اساتذہ اور مشائخ کا طریقِ ذکر

کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''لوگ جیسے علم حاصل کرتے تھے، ویسے ہی سیرت اوراخلاق بھی حاصل کرتے تھے۔''

بعض بزرگوں کا قول ہے:

''تہذیب اورادب کا ایک باب پڑھنا علم کے ستر بابوں کے پڑھنے سے افضل ہے۔''

اور حضرت مخلد بن حسین رَحِمَہُ اللّٰہُ کا ارشاد ہے:

''ہم لوگ حدیثیں زیادہ حاصل کرنے کے بہ جائے حسنِ ادب حاصل کرنے کے زیادہ محتاج ہیں۔'' (تذکرۃ السامع:۴-۵)

آج عام طور پر اہلِ مدارس نے اس پہلو کو اس طرح نظر انداز کردیا ہے، کہ گویا یہ کوئی غیر ضروری اور فضول کام ہے؛ بل کہ اکثریت کا حال یہ ہے، کہ صرف سبق پڑھادینے کے سوا اپنی کوئی ذمے داری ہی نہیں سمجھتے ، کہ طلبا تعلیم کے مطابق اپنے آپ کو بنانے اور سنوارنے کی عملی مشق بھی کرتے ہیں یا نہیں؛ بل کہ اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض مدارس کے اساتذہ بھی بدعملی و بداخلاقی کا شکار ہوتے ہیں، وہ بھلا کہاں اس کی طرف توجہ دیں گے؟

لہٰذا ضروری ہے کہ اہلِ مدارس اس پہلو سے بھی غور کریں اور طلبا کو علمی اعتبار سے بھی تیار کریں اور عملی واخلاقی اعتبار سے بھی تیار کریں۔

اس لحاظ سے جن باتوں کی طرف توجہ دینا چاہیے، ان میں سے بعض ظاہر سے متعلق ہیں اور بعض باطن سے متعلق ہیں۔

اصلاح ظاہر سے متعلق اہم امور یہ ہیں:

لباس اور وضعِ قطع

پہلی بات یہ ہے کہ طلبا کے لباس اور وضعِ قطع کی خوب نگرانی رکھی جائے۔بعض مدارس میں اس جانب کوئی توجہ نہیں دی جاتی؛ بل کہ اس کو فضول سمجھا جاتا ہے اور اس سلسلے میں طلبا کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے،جس کی وجہ سے وہاں کے طلبا ہر قسم کا لباس پہنتے ہیں اور ڈاڑھیاں کٹاتے ہیں، ٹخنے سے نیچے پاجامہ پہنتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے عادی ہوتے ہوتے ،وہ ان حرام کاموں کو جائز بھی سمجھنے لگتے ہیں؛ کیوں کہ ان کو کسی نے ان پر تنبیہ نہیں کی اور پھر اسی وضعِ قطع کے ساتھ جب عوام میں جاتے اور کہیں خدمت کرتے ہیں؛ تو عوام ان پر نکیر کرتے ہیں اور یہ اپنی شان باقی رکھنے کے لیے تاویل سے یا غلط فتوے سے کام لیتے ہیں؛ لہٰذا شرعی لباس اور شرعی وضعِ قطع کا ان کو پابند بنانے کے لیے نگرانی ضروری ہے۔

صفائی وسلیقہ مندی کی تربیت

اسی طرح ایک بات یہ ہے، کہ طلبا کی تربیت کے لیے ان کے ظاہر کی صفائی وستھرائی کا اہتمام کرایا جائے۔اسلام میں اس کی اہمیت کا سبھی کو علم ہے اور حدیث: ”اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَان “(طہارت آدھا ایمان ہے۔) کس سے پوشیدہ ہے؟ مگر افسوس یہ ہے کہ اس سلسلے میں اسلام کو ماننے والوں میں سب سے زیادہ کمی پائی جاتی ہے اور پھر اہلِ ایمان میں سے بھی عموماً اہلِ مدارس میں اس کا ظہور اور زیادہ ہے، جو انتہائی تشویش ناک بات ہے اور طلبا اس سلسلے میں عام طور پر سستی وغفلت کا

شکار ہوتے ہیں اور بسا اوقات اسکولوں کے لوگ اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس صورتِ حال سے علم واہلِ علم؛ بل کہ کبھی اسلام ہی سے بدظنی کا شکار ہوجاتا ہے؛ لہٰذا بہت ہی ضروری ہے کہ طلبا کو اس کا مکلّف بنایا جائے، کہ وہ روزانہ خود اپنی اور اپنی رہائش اور متعلقہ چیزوں کی صفائی کا خوب اہتمام کریں اور اس کے لیے استاذ مقرر کیا جائے، جو ان کی اس سلسلے میں نگرانی کرے، بالخصوص کم سن طلبا کے لیے اس کی نگرانی کا بہت زیادہ اہتمام ہونا چاہیے۔ مثلاً یہ کہ ان کے رہائش کمرے کی صفائی خود ان ہی سے کھڑے ہوکر کرائی جائے اور ان کے کپڑوں پر نظر کی جائے، کہ صاف ہیں یا نہیں، ان کے ناخنوں اور بالوں کی صفائی پر نظر رکھی جائے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''نظافت مطلوب ہے، اس کی ترغیب دی گئی ہے، ارشاد فرمایا کہ ''نَظِّفُوْا أَفْنِیَتَکُمْ ، وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْیَهُوْدِ'' کہ اپنے فنائے دار کو صاف رکھو اور اس کو میلا کچیلا رکھ کر یہود جیسے نہ بنو۔ جب فنائے دار تک کی نظافت مطلوب ہے؛ تو خود دار اور حجرے اور لباس وبدن کے صاف کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا؟ اب طالبِ علموں کی یہ حالت ہے، کہ چاہے دو بالشت کوڑا، ان کے حجرے میں ہوجائے؛ لیکن یہ کبھی بھی صاف نہ کریں گے۔
>
> (دعوات عبدیت: ۳۳/۳۱)

اس سلسلے میں حضرت اقدس مرشدنا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ کا ایک عجیب معمول دیکھا، وہ یہ کہ آپ جب کسی مدرسے میں تشریف لے جاتے اور اس کا معائنہ فرماتے؛ تو اولاً وہاں کے استنجا خانے دیکھتے اور فرماتے کہ اگر استنجا خانوں کی صفائی کا اہتمام ہے؛ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اور جگہوں کا زیادہ اہتمام ہوگا، بندے

کو متعدد مواقع پر اس کا موقع ملا، کہ حضرت والا کے ساتھ بعض مدارس کی زیارت کروں اور اس وقت حضرت کا یہ معمول دیکھا اور حضرت سے یہ بات سنی۔

اسی طرح یہ بھی اہم ہے، کہ انھیں سلیقہ سکھایا جائے: اٹھنے، بیٹھنے، بولنے، چلنے، پھرنے؛ نیز کسی سے بات چیت وملاقات، کسی کو کچھ پیش کرنے وغیرہ سے متعلق سلیقے کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ عام طور پر اس میں بھی طلبا کوتاہ ہوتے ہیں اور تربیت نہ ہونے سے اس میں مزید کوتاہی پیدا ہو جاتی ہے؛ لہٰذا اس کے لیے سبھی اساتذہ کو محنت کرنی چاہیے اور اس کے علاوہ مقرر نگران کو مستقل ذمے داری بھی دینی چاہیے، کہ وہ روزانہ طلبا کے کمروں اور متعلقہ اشیا پر ایک نظر ڈالے اور ان کو ترتیب وسلیقے کے ساتھ رکھنے کی ہدایت دے؛ تاکہ ان کو اسی کی عادت ہو جائے؛ ورنہ اس کے بغیر عالم ہو جانے کے باوجود بدسلیقہ لوگ تیار ہوں گے۔

سنن نبویہ اور اسلامی آداب کی تربیت

اسی میں یہ بھی داخل ہے، کہ طلبا کو سنتوں اور اسلامی آداب کا خوگر بنایا جائے، کھانے پینے، سونے جاگنے، مسجد جانے آنے وغیرہ کی جو سنتیں اور آداب اور ادعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، اساتذہ اور نگران حضرات کے ذریعے اس کی عملی مشق بھی کرائی جائے اور اس پر بار بار ان کو متنبہ بھی کیا جائے؛ ورنہ یہ باتیں صرف زبان پر تو ہوں گی؛ مگر عمل میں نہیں آئیں گی، چناں چہ بہت جگہ ان سنن وآداب کو یاد کرانے کے باوجود عملی تربیت سے تغافل برتا جاتا ہے، جس کی وجہ سے طلبا کے ذہنوں میں ان سنن وآداب کی کوئی اہمیت ہی نہیں پیدا ہوتی؛ اس لیے وہ ان کو یاد کر کے سنا بھی دیتے ہیں؛ مگر اس کے مطابق ان کا عمل نہیں ہوتا؛ تو آخر ان سنن وآداب کو پڑھانے کا کیا فائدہ ہوا؟

اصلاحِ باطن سے متعلق اہم امور یہ ہیں:

تقوی وطہارت

ایک تو یہ کہ طالبِ علم کوتقوے وطہارت کی زندگی پر ابھارا جائے اور ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی پاکیزگی کا اہتمام سکھایا جائے اور اس کی ضرورت واہمیت اس کے سامنے باربار واضح کی جائے۔کیوں؟

اس کی وجہ قاضی ابن جماعہ رَحِمَہُ اللّٰہُ سے سنیے،وہ کہتے ہیں:

" فإِنَّ العِلْمَ – كما قالَ بعضُهم – صَلاةُ السِّرِّ، وعِبادَةُ القَلب ، وقُربَةُ الباطِن ، وكَمَا لَا تَصِحُّ الصلاةُ الّتِي هِيَ عِبادَةُ الجَوارِح الظَّاهِرَةِ إلاَّ بِطَهَارَةِ الظَّاهِر مِنَ الحَدَثِ والخَبَثِ ، فكذلكَ لا يَصِحُّ العِلْمُ الَّذِي هُو عِبادَةُ القَلبِ إلاَّ بطهارتِهِ عَن خبث الصِّفَات وَحَدث مَسَاوِي الأخْلاقِ وَ رِدِيئِهَا." (تذكرة السامع:۲۴)

(کیوں کہ علم-جیسا کہ بعض علما نے کہا ہے-باطن کی نماز، دل کی عبادت اور باطن کی قربت کا نام ہے،پس جس طرح نماز، جوکہ اعضائے ظاہرہ کی عبادت ہے،وہ ظاہری نجاست (جیسے پیشاب،پاخانہ)اور حکمی نجاست (جیسے بے وضو و بے غسل ہونے) سے طہارت حاصل کیے بغیر صحیح نہیں ہوتی،اسی طرح علم جوکہ دل کی نماز ہے، وہ بھی صفات کی پلیدی اور برے وگھٹیا اخلاق کی ناپاکی سے دل کو صاف کیے بغیر صحیح ہوتا۔)

اوپر حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کا یہ ارشاد نقل کر آیا ہوں:

’’حدیث اس لیے حاصل کی جاتی ہے؛ تا کہ اس کے ذریعے
اللہ سے ڈرا جائے اور اسی وجہ سے اس کو دیگر علوم پر فضیلت ہے،
اگر یہ بات نہ ہو؛ تو وہ اور چیزوں کی طرح ایک چیز ہے۔‘‘

لہٰذا اگر تقویٰ مطلوب نہ ہو؛ تو یہ علم بھی دنیوی علم کی طرح ایک علم ہوگا اور اس کے طالب کو وہ فضیلت نہ ملے گی، جو اس علم کی بیان کی گئی ہے؛ اسی لیے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

’’وَيْلٌ لِمَن لا يَعْلَمُ وَلا يَعْمَلُ مَرَّةً ، وَوَيْلٌ لِمَنْ يَعْلَمُ
وَلا يَعْمَلُ سَبْعَ مَرَّاتٍ.‘‘ (جامع بيان العلم:٦/٢)

(جس نے نہ علم حاصل کیا اور نہ عمل کیا؛ اس کے لیے ایک
مرتبہ خرابی ہے اور جس نے علم تو حاصل کیا؛ مگر عمل نہیں کیا، اس
کے لیے سات مرتبہ خرابی ہے۔)

اور حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے:

’’ إنما العِلمُ لِيَتَّقِي اللّٰهَ بِه ، و يَعملَ به لآخرتِه، و
يَصْرِفَ عن نَفْسِه سُوءَ الدُّنيَا والآخِرَةِ ، وإلَّا فَالعَالِمُ
كالجَاهِلِ إذَا لَمْ يَتَّقِ اللّٰهَ بعِلمِه.‘‘ (تاريخ بغداد:٢١٣/٤)

(علم تو بس اس لیے ہے، کہ اس کے ذریعے اللہ سے ڈرے
اور اپنی آخرت کے لیے عمل کرے اور دنیا اور آخرت کی برائی دور
کرے؛ ورنہ عالم جاہل کی طرح ہے؛ اگر وہ اپنے علم سے اللہ
سے نہ ڈرے۔)

علم پر عمل

دوسری اہم چیز علم پر عمل کے لیے تیار کرنا ہے؛ کیوں کہ علم کی غرض و غایت ہی عمل ہے؛ اسی لیے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، کہ انھوں نے قرآنِ پاک کی ایک سورت ﴿سُوْرَةُ الْبَقَرَة﴾ بارہ سال میں یا چودہ سال میں مکمل کی۔ جیسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے، کہ بارہ سال میں ﴿سُوْرَةُ الْبَقَرَة﴾ ختم کی اور ختم پر ایک اونٹ ذبح کیا۔ (تفسير القرطبي:۱/۴۰)

اور حضرت عثمان، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس دس آیات پڑھاتے تھے اور دیگر آیات اس وقت تک نہیں پڑھاتے تھے، جب تک کہ ان دس آیات میں جو عمل ہے، اس کو نہ سیکھ لیتے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو قرآن اور اس پر عمل دونوں کی تعلیم دیتے تھے۔ (تفسير القرطبي:۱/۳۹)

بعض حکما نے فرمایا:

"لَو لاَ العَقْلُ لَم يَكُنْ عِلْمٌ ، ولَوْلا العِلْمُ لَمْ يَكُنْ عَمَلٌ ، وَلأَنْ أَدَعَ الحَقَّ جَهْلاً بِهِ خَيرٌ مِنْ أَنْ أَدَعَهُ زُهْداً فيه." (جامع بيان العلم :۲/۶)

(اگر عقل نہ ہوتی؛ تو علم نہ ہوتا اور اگر علم نہ ہوتا؛ تو عمل نہ ہوتا اور میں حق کو لاعلمی کی وجہ سے چھوڑ دوں؛ یہ بہتر ہے اس سے کہ میں حق کو اس سے لاپروائی کی وجہ سے ترک کر دوں۔)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ "عالم" کی تعریف ہی یہ کرتے ہیں، کہ وہ اپنے علم پر عمل کرنے والا ہو۔ وہ فرماتے ہیں:

" العَالِمُ الَّذِيْ وَافَقَ عِلْمُهُ عَمَلَهُ ، وَمَنْ خَالَفَ عِلْمُهُ عَمَلَهُ ، فَذٰلِکَ رِوَايَةُ حَدِيثٍ سَمِعَ شَيْئاً فَقَالَهُ."

(جامع بيان العلم:۹/۲)

(عالم وہ ہے، جس کا عمل اس کے علم کے موافق ہو اور جس کا عمل اس کے علم کے خلاف ہو؛ تو وہ بس حدیث کی روایت ہے، کہ جو سنا اس کو نقل کر دیا۔)

حضرت عبدالملک بن ادریس رحمہ اللہ کے اس سلسلے میں یہ اشعار بڑے عمدہ ہیں:

والعلمُ ليس بِنَا فِعٍ أَرْبابَهُ
مَا لَم يُفِدْ عَمَلاً وحُسْنَ تبصُّرِ

(علم، اہلِ علم کو اس وقت تک نفع نہیں دیتا، جب تک کہ وہ عمل اور عمدہ بصیرت کا فائدہ نہ دے۔)

سِيّانِ عِنْدِيْ عِلْمُ مَنْ لَمْ يَسْتَفِد
عَمَلاً بِهِ وصَلاةُ مَنْ لَمْ يَطّهِرِ

(میرے نزدیک اس کا علم، جس نے علم سے عمل کا فائدہ حاصل نہیں کیا اور بے وضو آدمی کی نماز دونوں برابر ہیں۔)

امام ابن القاسم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے سنا ہے:

" ليس العِلمُ بكثرةِ الرِّوَاية ، إنَّمَا العِلمُ نُوْرٌ يَضَعُهُ اللّٰهُ فِي القُلُوبِ."

(علم کثرت روایت کا نام نہیں ہے؛ علم تو ایک نور ہے، جو اللہ تعالے دلوں میں رکھتے ہیں۔)

نیز امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

" الحِكْمَةُ والعِلْمُ نُورٌ يِهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنْ يَشَاءُ وَلَيْسَ بِكَثْرَةِ المَسَائِلِ."

(الجامع لبيان العلم :۳۱/۲،الإلماع:۲۱۷/۱)

(علم وحکمت ایک نور ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں، ہدایت دیتے ہیں اور وہ بہت سارے مسائل کا نام نہیں ہے۔)

حضرت عبداللہ بن عون رحمہ اللہ کہتے ہیں:

" كانَ الفُقَهَاءُ يَتَوَاصَوْنَ بِثَلاثٍ و يَكْتُبُ بَعضُهُمْ إلٰى بَعْضٍ: أنَّهُ مَن أصْلَحَ سَرِيْرَتَهُ أصْلَحَ اللّٰهُ عَلانِيَته ومَن أصْلَحَ مَا بَيْنَهُ و بَيْنَ اللّٰهِ ، أصْلَحَ اللّٰهُ مَا بَيْنَهُ وَ بَيْنَ النَّاس ، وَمَنْ عَمِلَ لِلآخِرَةِ كَفَاهُ اللّٰهُ الدُّنْيَا."

(الإلماع:۲۲۲/۱)

(فقہائے کرام تین وصیتیں فرماتے تھے اوران میں سے بعض بعض کو لکھتے تھے: ایک یہ کہ جس نے اپنی خلوت کا معاملہ درست کرلیا؛ اللہ تعالیٰ اس کی جلوت کا معاملہ درست فرما دیتے ہیں۔ دوسری یہ کہ جس نے اپنے اور اللہ کے درمیان معاملے کو درست کرلیا؛ اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے درمیان معاملے کو درست فرمادیتے ہیں اور تیسری یہ کہ جس نے آخرت کے لیے عمل کیا؛ اللہ اس کی دنیا کے لیے کافی ہوجاتے ہیں۔)

الغرض طلبا کو علم کے ساتھ عمل کی طرف توجہ دلانا اور اس کی نگرانی کرتے رہنا ضروری ہے؛ تاکہ وہ اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عملی زندگی میں علم کو بہ روئے

کار لانے والے بن سکیں۔

نیز طلبائے کرام کو بتایا جائے، کہ بدعمل اور بےعمل عالم کے لیے کس قدر وعید شدید وارد ہوئی ہے۔ مثلاً: یہ حدیث کس قدر ہم کو چونکا رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" مَنْ تَعَلَّمَ عِلْماً مِمَّا يُبْتَغىٰ بِهِ وَجْهُ اللّٰهِ لَا يَتَعَلَّمُهُ إِلَّا لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضًا مِنَ الدُّنْيَا لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ."

(جو شخص اس علم میں سے جو صرف اللہ کی رضا کے لیے حاصل کیا جاتا ہے، اس کو اس لیے حاصل کرتا ہے، کہ اس سے دنیا کا سامان کمائے؛ تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو نہیں پائے گا۔)

(أبو داود:۳۶۶۴، ابن ماجة:۲۵۲، أحمد:۸۴۳۸، صحيح ابن حبان:۲۷۹/۱، المستدرك للحاكم:۱۶۰/۱)

اور یہ حدیث کس قدر لائق توجہ ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

" تَعَوَّذُوا بِاللّٰهِ مِنَ جُبِّ الْحُزْنِ."

(تم لوگ جب الحزن یعنی غم کے کنویں سے اللہ کی پناہ مانگو۔)

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: " يَا رَسُولَ اللّٰهِ ! وَمَا جُبُّ الْحُزْنِ؟

(یا رسول اللہ! یہ غم کا کنواں کیا ہے۔)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" وَادٍ فِي جَهَنَّمَ تَتَعَوَّذُ جَهَنَّمُ فِي كُلِّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ "

(یہ جہنم میں ایک وادی ہے، جس سے خود جہنم بھی روزانہ سو دفعہ

پناہ مانگتی ہے۔)

صحابہ نے پوچھا کہ ''یارسول اللہ! اس میں کون لوگ داخل ہوں گے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'' الْقُرَّاءُ الْمُرَاءُوْنَ بِأَعْمَالِهِمْ. '' (الترمذي:۲۳۸۳)

(وہ قرا، جو اپنے اعمال سے دکھاوا کریں گے۔)

اور اسی حدیث کی بعض روایات میں ہے، کہ اس وادی سے جہنم چار سو مرتبہ روزانہ پناہ مانگتی ہے۔ (سنن ابن ماجة:۲۵۶، المعجم الأوسط للطبراني:۳/۲۶۱)

علمی وقار وشان

ایک بات یہ ہے کہ طلبا کے اندر علمی وقار وشان پیدا کی جائے ،اس سے مراد بڑائی وتکبر نہیں ؛ بل کہ چھچھورے پن سے حفاظت اور ان خصوصیات کو پیدا کرنے کی کوشش ہے، جو علمی وقار کو بلند کرتی ہیں۔ وہ کیا چیزیں ہیں؟ ان کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح بیان فرمایا:

'' يَنبَغِي لِقَارِي الْقُرْآنِ أَنْ يُعْرَفَ بِلَيْلِهِ إِذَا النَّاسُ نَائِمُونَ، وَ بِنَهَارِهِ إِذَا النَّاسُ مُسْتَيْقِظُون، و بِبُكَائِهِ إِذَا النَّاسُ يَضْحَكُون، و بِصَمْتِه إِذَا النَّاسُ يَخُوْضُوْن، و بِخُضُوْعِه إِذَا النَّاسُ يَخْتَالُوْن، و بِحُزْنِه إِذَا النَّاسُ يَفْرَحُوْنَ. '' (تفسير القرطبي:۱/۲۱)

(قاری یعنی عالم قرآن کے لیے شایانِ شان بات یہ ہے، کہ وہ اس کی رات (کی عبادت وریاضت سے) سے پہچانا جائے، جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں اور اس کے دن (کی دین کے لیے قربانیوں

اور دعوت الی اللہ وتبلیغ شریعت) سے بھی وہ جانا جائے، جب کہ لوگ بیدار ہوں اور اس کے (خوف وخشیت سے) رونے کی وجہ سے پہچانا جائے، جب کہ لوگ ہنس رہے ہوں اور (غور وفکر کی وجہ سے) اپنی خاموشی سے پہچانا جائے، جب کہ لوگ گپیاں مار رہے ہوں اور اپنی تواضع وخاکساری سے پہچانا جائے، جب کہ لوگ ڈینگیں مار رہے ہوں اور اپنے (امت کے اور آخرت کے)غم سے جانا جائے، جب کہ لوگ خوشیاں منارہے ہوں۔)

اگر علما وطلبہ اس کے بہ جائے عوام الناس ہی کی طرح گپیاں ماریں، ٹھٹا مار کر ہنستے بیٹھیں، خوف وخشیت کا کوئی اثر ان کے اخلاق واعمال واحوال وآثار سے ظاہر نہ ہو؛ تو یہ کیا علم ہے اور کیا علمی وقار؟ جیسا کہ آج بہت سے علما نے اس وقار کو چھوڑ کر اور عوامی؛ بل کہ جاہلی طریقے کو اختیار کر کے اللہ کی نظر میں بھی اور عوام الناس میں بھی اپنا وقار ختم کرلیا ہے؛ لہٰذا ان سب امور پر طلبائے کرام کی فہمائش وتنبیہ ہوتی رہنی چاہیے۔

انتظامیہ سے متعلق قابل توجہ امور

آخر میں ''انتظامیہ'' سے متعلق چند اہم باتیں عرض ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مدارس کی انتظامیہ پورے طور پر مدارس کی ہر بات کی ذمے دار ہوتی ہے، مدارس کی خوبی اگراس کی جانب منسوب ہوتی اوراس کا سہرااس کے سر بندھتا ہے؛ تواسی طرح مدارس کی ناکامی و برائی، اس کا عیب وکھوٹ بھی لامحالہ اسی کی طرف منسوب ہوگا؛ اس لیے ذمے دارانِ مدارس جہاں اپنی ذمے داری کونباہنےاوراپنی صلاحیت وقوت وطاقت کے صحیح استعمال پر فضیلت وثواب کے مستحق ہیں، وہیں اپنی صلاحیتوں اور قوت وطاقت کے غلط ونا جائز استعمال پر عذاب کے مستحق بھی ہوسکتے ہیں اور ساری کاروائیاں رائیگاں بھی جاسکتی ہیں۔

لہٰذا ذمے دارانِ مدارس کو بھی اپنے اندر خوف وخشیت، تقوی و پرہیز گاری، شریعت وسنت کی پاس داری کا پورا پورا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے؛ تاکہ وہ صحیح طریقے پراس اہم ترین کام کوانجام دے سکیں۔

یہاں انتظامیہ سے متعلق چند اہم امور پیش کرتا ہوں:

مدرسین وطلبہ کے اکرام میں کوتاہی

انتظامیہ دوقسم کی ہوتی ہے: ایک غیر علما پر مشتمل۔ دوسری علما پر مشتمل۔اور دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر علما جوکسی مدرسے کے ذمے دار ہوجاتے ہیں؛ تو وہاں کے علما اور مدرسین پراس طرح حکومت کرتے ہیں، جیسے کوئی حاکم ہواور علما کا وقاراوران کی تعظیم وتکریم کا کوئی حق ادانہیں کرتے؛ بل کہ بعض جگہ توان کے وقار کومجروح کیا جاتا ہے

اوران لوگوں کا عمل دخل ہر چیز میں ہو جاتا ہے، حتی کہ تعلیم وتربیت میں بھی یہ لوگ بے جامداخلت کرنے لگتے ہیں، جس کے نتیجے میں عام طور پر ایسے مدارس ناکامی کا شکار ہوجاتے ہیں۔

اس لیے اس قسم کے ذمے داروں کو چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت وقابلیت پر نظر کرتے ہوئے مداخلت کے حدود قائم کریں اوراسی کے ساتھ مدرسے کے اساتذہ وعلما کا وقار قائم رکھیں اوران کواپنا خادم نہیں؛ بل کہ خود کو بھی اوران کو بھی دین کا خادم خیال کریں اور تعلیمی وتربیتی امور میں علما و مدرسین کی رائے کومقدم رکھیں، اس سے ان شاء اللہ العزیز مدارس کامیابی کی راہ پر گامزن ہوں گے۔

اور جو مدارس علما کے زیرنگرانی چلتے ہیں، ان میں بھی بعض جگہ وہی قابلِ نکیر باتیں ملتی ہیں، کہ مدرسین واساتذہ کے ساتھ ذمے دار علما، وہ سلوک کرتے ہیں، جو علما کے شایانِ شان نہیں؛ بل کہ اپنے زیردستوں اور خادموں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ یہ قابلِ اصلاح وقابلِ نکیر بات ہے: کیوں کہ کوئی مدرس، مہتمم کا خادم نہیں ہوتا اور نہ ذمے دارانِ مدرسہ کا خادم ہوتا ہے؛ بل کہ وہ تو اللہ کے دین کا خادم ہوتا ہے۔

لائق اساتذہ کا انتخاب

دوسری بات یہ ہے کہ مدارس میں ذمے داروں کی ایک اہم ترین ذمے داری، یہ بھی ہے کہ وہ اچھے اساتذہ کا انتخاب کریں، جو اپنے اندر صلاحیت و صالحیت دونوں عناصر رکھتے ہوں، ان میں ایک طرف اگر علمی استعداد و قابلیت عمدہ ہو، تدریسی صلاحیت اورافہام وتفہیم کی لیاقت ہو؛ تو دوسری جانب ان میں اخلاص وللّٰہیت، تقوی وطہارت، خوف وخشیت، رجوع الی اللہ وانابت، اخلاق حمیدہ و صفات جمیلہ بھی موجود ہوں اوراسی کے ساتھ محنتی ومجاہد مزاج ہوں؛ تاکہ طلبا کی تعلیم

وتربیت کی جو ذمے داری ان پر عائد ہوتی ہے؛ وہ پوری کی جا سکے، اگر ایسا نہ کیا گیا اور قابلِ اساتذہ کی جگہ ناکارہ اساتذہ اور غلط کار استادوں کو رکھا گیا، تو اللہ کے یہاں اس کی باز پرس ہونے کے علاوہ مدرسے کے قیام کا مقصد ہی پورا نہ ہوگا؛ مگر افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے، کہ بعض جگہ کے اساتذہ کی تعلیمی قابلیت یا عملی صلاحیت دیکھ کر رونے کو جی چاہتا ہے اور بہت جگہ یہ صورتِ حال بھی دیکھنے میں آتی ہے، کہ اساتذہ میں تعلیمی صلاحیت تو خوب ہے؛ مگر تقوی وطہارت اور عمل و اخلاق سے بے بہرا ہیں، یا ان کا انداز وطور طریقہ سوقیانہ یا جاہلانہ ہے، یا تہذیب و شائستگی سے دور ہیں۔ بھلا ایسے لوگوں سے طلبا کی تربیت کس طرح ہو سکے گی؟ اور وہ ان کو کس طرح قابل وصالح، با اخلاق و باکردار بنا سکیں گے؟ جب یہ خود محتاج اصلاح ہیں، تو دوسروں کی کیا اصلاح کر سکیں گے؟ بل کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ طلبا کو اور زیادہ بگاڑ دیں گے۔

اس سلسلے میں جو کوتاہی ہوتی ہے، اس کی وجہ بعض اداروں میں یہ دیکھنے میں آئی ہے، کہ انتظامیہ اساتذہ کے انتخاب میں صرف یہ پیشِ نظر رکھتی ہے، کہ مدرس ہماری ہاں میں ہاں ملانے والا اور ذاتی طور پر ہمارا تابع دار ہو، خواہ صلاحیت وصالحیت اس میں ہو یا نہ ہو، اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اسی طرح ناکارہ مدرس کو اس لیے برداشت کیا جاتا ہے، کہ وہ انتظامیہ کی اچھی وبری بات میں تائید کرتا ہے اور اچھے وماہر اساتذہ کو اس لیے برخواست کر دیا جاتا ہے، کہ وہ انتظامیہ کی اس طرح تائید نہیں کرتا یا ان کا ذاتی طور پر تابع دار نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہے اور کیا ہو سکتا ہے، کہ مدارس میں ناکاروں کی ایک ٹیم جمع ہو جائے اور حق وناحق میں انتظامیہ کی ہاں میں ہاں ملائے۔ جسے نہ پڑھنا ہے، نہ پڑھانا ہے۔ یہ صورتِ حال مدارس ومدارس کے طلبہ کے حق میں کس قدر خطرناک ہے، وہ ظاہر ہے۔

توکل علی اللہ ہی مدارس کا سرمایہ ہے

ایک اہم بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ انتظامیہ کو یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے، کہ مدرسہ اللہ پر توکل کی بنیاد پر چلتا ہے؛ اس لیے انھیں صرف توکل علی اللہ کا سرمایہ جمع کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، جب اللہ پر بھروسہ ہوگا، تو اللہ تعالیٰ غیب سے انتظام کریں گے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: " **وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ**" (جو اللہ پر توکل کرتا ہے؛ اللہ تعالیٰ اس کے لیے کافی ہیں۔)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے جب "دار العلوم" قائم کیا؛ تو یہی فرمایا تھا کہ یہ مدرسہ توکل علی اللہ کی بنیاد پر چلایا جائے؛ ورنہ اس کی خیر نہیں۔

"تاریخِ دار العلوم" میں ہے:

"جب بنیاد رکھی جا چکی، تو حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ" عالمِ مثال میں اس مدرسے کی شکل ایک معلق ہانڈی کے مانند ہے، جب تک اس کا مدار توکل اور اعتماد علی اللہ پر رہے گا، یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا۔"

اس واقعے کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ نے ذیل کے اشعار میں نظم کیا ہے:

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کے لیے
کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ
یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہو جائے گا
ہے توکل پر بنا اس کی تو بس اس کا معین
ایک گر جائے گا پیدا دوسرا ہو جائے گا

(تاریخِ دار العلوم دیوبند: ۱/۱۸۴)

آج بعض مدارس والوں میں توکل و اعتماد علی اللہ کی کمی کی وجہ سے دیکھا جاتا ہے کہ وہ حلال وحرام کا خیال ہی نہیں کرتے، اچھے و برے کی تمیز سے غافل ہوتے ہیں اور جو بھی ملے جہاں سے بھی ملے، اس کو لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیز بعض جگہ اس سلسلے میں دھوکہ وفریب سے بھی کام لینے والے لے لیتے ہیں۔ نیز مدِ زکاۃ کی رقم دوسرے مصرف میں بلا تملیک خرچ کردی جاتی ہے؛ نیز چندہ وصول کرنے کے لیے بعض ناجائز امور کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ جیسے بعض جگہ مدارس میں یہ رواج عام ہوگیا ہے کہ سفیروں کے پاس طلبا کی تصاویر کا ایک البم دے کر بھیجا جاتا ہے، جو سارے لوگوں کو دکھاتا پھرتا ہے، حال آں کہ تمام علمائے کرام کے نزدیک جاندار کی تصویر لینا، رکھنا اور دکھانا سب ناجائز ہے۔ جب خود اہلِ مدارس اس حرام کا ارتکاب کریں گے؛ تو دوسروں کو حرام سے کس طرح روک سکیں گے؟ یہ ساری باتیں اس لیے ہوتی ہیں کہ اللہ کی ذات پر توکل میں کمزوری ہوتی ہے۔

یہاں اکابرین کے بعض واقعات کا ذکر بے محل نہ ہوگا، جن سے توکل علی اللہ کی برکات سامنے آتی ہیں:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا توکل

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”کانپور میں جب میں پڑھاتا تھا، تو مدرسے کی مسجد میں طلبا کے لیے ایک حوض تیار کرانے کی ضرورت ہوئی اور روپیہ تھا نہیں اور کسی سے چندہ مانگنے کو طبیعت نے گوارہ نہ کیا۔ بس میں نے مدرسے والوں سے کہا کہ تم اپنے اختیار کا کام کردو اور ایک جگہ متعین کرکے گڑھا کھدوادیا گیا اور چھوڑ دیا گیا، لوگ دریافت

کرتے کہ یہ کیا ہے؟ ہم کہتے کہ حوض ہے، جتنی ہمارے اندر طاقت تھی اور جتنا سامان ہمارے پاس تھا، اتنا ہم نے کرلیا آگے اللہ تعالیٰ مالک ہے، دوایک دن تو یوں ہی پڑا رہا، اس کے بعد ایک دن محلے میں ایک بڑی بی نے مجھ کو اپنے گھر بلایا اور کہا کہ میں نے سنا ہے کہ ایک حوض تجویز ہوا ہے، اس کا کیا انتظام کیا گیا ہے؟ میں نے کہا کہ جتنا کام ہمارے اختیار میں تھا، اتنا کرا دیا ہے، کہنے لگیں کہ کیا تخمینہ ہے؟ میں نے کہا کہ پانچ سو روپے، کہنے لگیں کہ میں دوں گی، میرے سوا کسی کا روپیہ نہ لگے۔ اب اور لوگ بھی آنے شروع ہو گئے کہ صاحب ہمارے پانچ روپے قبول کیجیے، ہمارے دس قبول روپیے کیجیے، میں نے کہا کہ ایک بی بی نے ایسا کہہ دیا ہے، ہاں ایک سائبان کی تجویز ہے کہ اس کے اوپر ڈالا جائے، کہنے لگے کہ تو پھر ہم اسی کے لیے دیتے ہیں، چناں چہ حوض بھی تیار ہو گیا اور سائبان بھی تیار ہو گیا۔

(القول الجلیل:۲۲)

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا توکل

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مولانا گنگوہی رحمہ اللہ کے یہاں حدیث کے دورے میں ستر ستر طالب علم ہوتے تھے، ان کا کھانا بھی کپڑا بھی ہوتا تھا؛ مگر کوئی فکر ہی نہیں، نہ چندے کی تحریک کی، نہ کبھی کسی سے فرمایا، ایک کمرہ بھی نہیں بنوایا، نہ وہاں چندہ تھا نہ کچھ تھا، پھر بھی وہاں خندہ ہی خندہ تھا۔

(حسن العزیز:۱/۵۰۹)

حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کا توکل

میرے استاذ وشیخ مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کے مدرسے ''جامعہ مفتاح العلوم، جلال آباد'' میں آج بھی کوئی مستقل سفیر نہیں ہے اور نہ کہیں اس کے چندے کا اعلان واشتہار ہوتا ہے، شروع دور میں مدرسے کا چندہ اساتذہ کے ذریعے کیا جاتا تھا؛ مگر بعد میں حضرت نے چندے کا سلسلہ بند کر دیا؛ مگر اس کے باوجود توکل کی برکت سے مدرسہ بلا کسی تنگی وپریشانی قائم ودائم ہے اور مدرسے کی تمام ضروریات پوری ہورہی ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت کی وفات کے بعد میری ''جلال آباد'' حاضری ہوئی اور حضرت کے صاحب زادۂ محترم حضرت مولانا صفی اللہ صاحب دامت برکاتہم، جو ''بھائی جان'' کے نام سے معروف ہیں اور میرے استاذ بھی ہیں، ان کی خدمت میں حاضری ہوئی، درمیان گفتگو میں فرمایا کہ مولوی صاحب! الحمدللہ مدرسے میں بڑے (مراد حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ ہیں) کی برکت سے اتنا مال آرہا ہے، کہ اگر آج سے ایک پیسہ بھی نہ آئے؛ تب بھی مدرسہ دس سال تک اسی طرح چل سکتا ہے۔

اس سے توکل کی برکات صاف اور واضح طور پر سمجھ میں آتی ہیں؛ لہٰذا ہمیں بھی بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اصلاً توکل علی اللہ ہی کو مدارس کے لیے اصل سرمایہ سمجھنا چاہیے، باقی تدبیر کے طور پر حدودِ شرعیہ میں رہتے ہوئے باوقار طریقے پر چندہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

چندے کی وصولی میں احتیاط

انتظامیہ کے متعلق ایک بات یہ عرض کرنا ہے، کہ بعض مدارس کے ذمے دار اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، کہ مال کس طرح وصول وجمع ہو، حلال ذریعے سے یا

حرام ذریعے سے؟ بل کہ ان کا مطمحِ نظر یہ ہوتا ہے، کہ کسی بھی طریقے سے مال آجائے، بل کہ بعض جگہ کے ذمے داروں سے یہ سنا گیا، کہ حلال وحرام اور شریعت کو ایک طرف رکھو؛ ورنہ مدرسہ کس طرح چلے گا؟ **لا حول ولا قوۃ إلا باللہ!!** یہ تو وہ بات ہے، جو دین سے لاپرواہ؛ بل کہ بد دین قسم کے لوگ کہا کرتے ہیں ؛ مگر اب اہلِ مدارس کی زبانوں پر بھی یہ الفاظ آنے لگے۔

اور اسی لیے بعضِ مدارس میں کمیشن پر چندے کا سلسلہ بھی جاری ہے، حال آں کہ علما و مفتیانِ کرام نے بعدِ بحث و تمحیص و تحقیق و تدقیق اس کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر اس میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض مدارس میں سفیر کو ساٹھ فیصد کمیشن دیا جاتا ہے اور مدرسے کو اس سے صرف چالیس فیصد ملتا ہے؛ مگر یہ لوگ اس لیے اس پر بھی خوش ہیں کہ بہ ہر حال کچھ تو آرہا ہے۔ اہلِ مدارس کے لیے یہ بات کس قدر معیوب ہے؟ کہ وہ خود حلال وحرام کا لوگوں کو درس دیں، پھر خود ہی اس کی کوئی پرواہ نہ کریں۔

الغرض یہ ضروری ہے کہ حرام ذرائع سے اجتناب کریں؛ ورنہ اس چندے سے نہ علم پھیلے گا، نہ علم کی برکات ظاہر ہوں گی اور نہ طلبا کے اندر کوئی خیر و بھلائی پیدا ہوگی؛ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ و رسول ہی خوش نہیں، تو آخر اس طرح مدرسہ چلانے سے کیا فائدہ؟ مدرسہ چلانے سے اصل مقصود تو اللہ کی خوشنودی و رضا کا حصول ہے، خواہ وہ چھوٹے مدرسہ سے حاصل ہو یا بڑے سے حاصل ہو یا بغیر مدرسے کے حاصل ہو۔

حضرت مولانا تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ”اہلِ مدارس کہتے ہیں کہ سوال نہ کیا جائے، تو کام کیسے چلے؟ ارے! ہم کہتے ہیں کہ کام سے مقصود کیا ہے؟ رضا، وہ تو نہیں گھٹی، جب سو طالب علموں کی خدمت اختیار میں تھی، سو کی خدمت کرتے تھے، اب جب پانچ کی اختیار میں ہے، پانچ کی

کریں گے، کام ہلکا اور ثواب وہی، پھر غم کس چیز کا؟''

(حسن العزیز: ۱/۵۸۳)

الغرض اہلِ مدارس کو اللہ پر نظر کرنا چاہیے اور اسی پر توکل و بھروسہ رکھنا چاہیے، مدرسہ چلانے کے لیے حلال وحرام کی تمیز نہ کرنا اور اس کے لیے الٹی سیدھی تدبیریں کرنا، مدارس کی شان؛ بل کہ ان کے مقصد وجود ہی کے بالکل خلاف ہے۔

حسابات میں صفائی

ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ بعض جگہ حسابات میں صفائی کا اہتمام نہیں ہوتا اور اس میں دو قسم کے لوگ ہیں: ایک تو وہ جو اپنے بھولے پن سے صحیح طریقے پر حساب کتاب کا اہتمام نہیں کرتے اور دوسرے وہ ہیں: جو محض چالبازی سے ایسا کرتے ہیں، جس کی وجہ سے مدارس بدنام ہوتے ہیں۔

''رابطۂ مدارس'' کی منظور شدہ تجاویز میں بھی اس بات کی اہلِ مدارس کو تاکید کی گئی ہے، کہ حسابات آمد وخرچ صاف رکھے جائیں اور مستند آڈیٹر سے ان کی جانچ کرائی جائے۔

جہاں تک ان بھولے بھالے لوگوں کا مسئلہ ہے، ان سے تو یہ گزارش ہے کہ وہ معتبر مدارس میں آ کر وہاں کے حسابات لکھنے اور رکھنے کے طریقۂ کار کو دیکھیں اور سمجھیں اور اسی کے مطابق اپنے یہاں جاری کریں۔

میں ایک مدرسے میں گیا، تو وہاں کے ناظم صاحب نے مختلف اقسام کے رجسٹر دکھائے، جو سب کے سب تعلیم سے متعلق تھے، میں نے پوچھا کہ حسابات کا رجسٹر کہاں ہے؟ تو کہا کہ کوئی رجسٹر اس کا نہیں ہے۔ ہم ویسے ہی ایک اندازے سے ایک کاپی میں کچھ لکھ لیتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ وہی آپ کی کاپی دکھایئے۔ تو وہ کاپی لائے، اس میں ایک ایک ماہ کا حساب ایک ایک صفحہ پر درج تھا، کہ مطبخ کا خرچہ

اتنا، اساتذہ کی تنخواہ اتنی وغیرہ؛ مگر نہ کسی کا کوئی اوچر (voucher) ہے اور نہ کسی مد کی کوئی تفصیل۔ ظاہر ہے کہ اس کا نام تو حساب نہیں ہے اور قانونی طور پر اس کو کوئی قبول نہیں کرتا۔ پھر میں نے ان کو فہمائش کی، تو کہا کہ یہ تو ہمیں معلوم ہی نہیں کہ اس میں اتنی باریکیاں ہیں۔

رہے وہ لوگ جو چالبازی سے حسابات کو صحیح مرتب نہیں کرتے اور غلط وجھوٹے حساب مرتب کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور اللہ کے پاس حساب سے پہلے دنیا ہی میں صاف کر لیں۔

رقوم کی مدات کا لحاظ

ایک بات اہلِ انتظام کے متعلق یہ ہے کہ آمدنیات میں مختلف مدوں کا الگ الگ لحاظ بھی ضروری ہے: زکاۃ، نذر ومنت اور واجب صدقات کا ایک مد ہوتا ہے اور عام عطایا اور نفلی صدقات کا دوسرا مد ہوتا ہے۔ شرعاً ان مدات کے مصارف الگ الگ ہیں۔ ان میں گڈ مڈ کرنا ناجائز ہے، زکاۃ اور اسی کے حکم میں نذر ومنت ہیں، ان کا مصرف شریعت میں منصوص ومقرر ہے اور وہ قرآن کے مطابق آٹھ مصارف ہیں، ان آٹھ کے سوا کسی اور جگہ زکاۃ ونذر کی رقومات کا خرچ کرنا ناجائز ہے اور اس سے ایک قول کے مطابق زکاۃ ونذر پوری نہیں ہوتی اور ایک قول کے مطابق دینے والوں کی زکاۃ ونذر تو پوری ہو جاتی ہے؛ مگر چوں کہ ان خرچ کرنے والوں نے غلط جگہ خرچ کیا ہے؛ اس لیے ان کی قیامت میں سرزنش کی جائے گی۔

اس مسئلے کی تفصیل یہ ہے کہ بعض علما کے نزدیک مدارس کے ذمے دار طلبا کے وکیل ہیں اور جب ان ذمے داروں نے طلبا کے وکیل کی حیثیت سے زکاۃ وصول کر لی؛ تو زکاۃ دینے والوں کی زکاۃ ادا ہو گئی؛ مگر چوں کہ ان ذمے داروں نے اس کو

اصل مصرف پر خرچ نہیں کیا؛ اس لیے وہ ماخوذ ہوں گے اور بعض علما کے نزدیک اہلِ مدارس، زکاۃ دہندہ لوگوں کے وکیل ہیں؛ اس لیے ان مدارس والوں کے پاس رقم کے آجانے سے زکاۃ ادا نہیں ہوتی؛ بل کہ جب یہ اس کو مصرف پر خرچ کریں گے؛ تب ادا ہوگی اور انھوں نے ادا نہیں کیا؛ اس لیے زکاۃ ہی ادا نہیں ہوئی۔

بہ ہر صورت اس کی اہمیت ثابت و ظاہر ہے، کہ زکاۃ و نذر و منت کی رقومات کو ان کے مصرف میں خرچ کرنے کا اہتمام و التزام چاہیے، اسی طرح جو عام صدقات و نفلی عطیہ جات ہیں، وہ بھی چوں کہ دینے والوں نے مدرسے کی ضرورت اور اس کے بقا و تحفظ کا سامان کرنے کے لیے دیا ہے؛ لہٰذا ان کو بھی ان ہی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے خرچ کیا جانا چاہیے۔

مگر کس قدر افسوس کی بات ہے! کہ بعض مدارس میں اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا؛ بل کہ سب ایک ہی مد میں جمع کیا جاتا ہے اور اسی طرح خرچ بھی بلا کسی فرق و امتیاز کے کیا جاتا ہے اور اس کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا، کہ دینے والوں نے کن مقاصد کی خاطر دیا ہے؛ بل کہ جیسا چاہتے ہیں خرچ کرتے ہیں۔ جیسے کوئی اپنا ذاتی روپیہ ہو؛ لہٰذا اس طرف بھی اہلِ مدارس کو پوری توجہ دینی چاہیے، کہ آمدنی کونسی مد کی ہے اور یہ کہ کیا وہ اس کے مصرف میں خرچ ہو رہی ہے؟ اور یہ کہ چندہ دہندگان کے مطابق خرچ ہو رہی ہے؟

علامہ بنوری رحمہ اللہ اور مدات رقوم میں احتیاط

حضرت مولانا علامہ یوسف بنوری رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ مدرسے میں آنے والی رقوم اور ان کے خرچ کے سلسلے میں انتہائی و بے نظیر احتیاط برتتے تھے اور خازنِ مدرسہ کو حکم دیا تھا، کہ بنیادی طور پر مدرسے کے دو فنڈ اور بینک

میں دو علاحدہ علاحدہ اکاونٹ ہونے چاہئیں۔ ایک زکوۃ کا فنڈ، دوسرا امدادی فنڈ، اوردونوں فنڈ ایک دوسرے سے علاحدہ رکھے جائیں۔

(ماہنامہ بینات، علامہ بنوری نمبر: ۲۲۲)

مدارس کی رقوم کے خرچ میں احتیاط

خرچ میں احتیاط اوراس میں لاپروائی سے رکنا بھی ضروری ہے۔ اکابرین نے اس سلسلے میں جو احتیاط برتی ہے، وہ ہمارے لیے نمونہ ہے۔

حضرت شیخ الحدیث نوراللہ مرقدہ نے اس سلسلے میں اکابرین کے چند واقعات لکھے ہیں، یہاں بعض کا نقل کردینا مناسب ہے:

مولانا احمد علی صاحب محدث رحمہ اللہ کی احتیاط

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ حضرت اقدس مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رحمہ اللہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”وہ جب ”مظاہرِعلوم“ کی تعمیر کے چندے کے سلسلے میں ”کلکتہ“ تشریف لے گئے، تو مرحوم نے سفر سے واپسی پر اپنے سفر کی آمد وخرچ کا مفصل حساب مدرسے میں داخل کیا، وہ رجسٹر میں نے خود پڑھا ہے، اس میں ایک جگہ لکھا تھا کہ ”کلکتہ“ میں فلاں جگہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا، اگر چہ وہاں چندہ خوب ہوا؛ لیکن میری سفر کی نیت دوست سے ملنے کی تھی، چندے کی نہیں تھی؛ اس لیے وہاں آمد ورفت کا اتنا کرایہ حساب سے وضع کرلیا جائے۔ (آپ بیتی: ۲۷)

حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی رحمہ اللہ کی احتیاط

حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی رحمہ اللہ جن کے نام پر مدرسے کا نام ''مظاہرِ علوم'' تجویز کیا گیا تھا، ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کا معمول تھا کہ مدرسے کے اوقات میں جب کوئی مولانا کا عزیز ذاتی ملاقات کے لیے آتا، تو اس سے باتیں شروع کرتے وقت گھڑی دیکھ لیتے اور واپسی پر گھڑی دیکھ کر حضرت کی کتاب میں ایک پرچہ رکھا رہتا تھا، اس پر تاریخ اور منٹوں کا اندراج فرما لیتے اور ماہ کے ختم پر ان کو جمع فرما کر اگر نصفِ یوم سے کم ہوتا؛ تو آدھ روز کی رخصت اور اگر نصفِ یوم سے زیادہ ہو؛ تو ایک روز کی رخصت مدرسے میں لکھوا دیتے۔''

(آپ بیتی: ۲۸)

حضرت مولانا خلیل احمد محدث رحمہ اللہ کی احتیاط

حضرت شیخ زکریا صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''حضرت اقدس سہارنپوری رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک صاحب عزیزوں میں سے جو بڑے رتبہ کے آدمیوں میں سے تھے، ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ حضرت سبق پڑھا رہے تھے، اختتامِ سبق تک تو حضرت نے توجہ ہی نہ فرمائی، ختم سبق کے بعد حضرت ان کے پاس تشریف لائے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ حضرت اسی جگہ تشریف رکھیں۔ حضرت رحمہ اللہ

نے ارشاد فرمایا کہ مدرسے نے یہ قالین اسباق پڑھانے کے لیے دیا ہے، ذاتی استعمال کے لیے نہیں دیا۔ اس لیے اس قالین سے علیحدہ بیٹھ گئے۔ البتہ یہ واقعہ میرا ہمیشہ کا دیکھا ہوا ہے، کہ مدرسۂ قدیم (دفترِ مدرسہ) میں حضرت کی ہمیشہ دو چارپائی رہتی تھیں، انھیں پر حضرت آرام فرماتے تھے، انھیں پر بیٹھتے تھے۔ مدرسے کی اشیا کو میں نے استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' (آپ بیتی:۲۹)

مولانا عنایت الٰہی رحمہ اللہ کی احتیاط

''مظاہرِ علوم'' کے مہتمم حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب رحمہ اللہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آپ کے پاس دفتر میں دو قلمدان تھے: ایک مدرسے کا تھا، دوسرا اپنا ذاتی۔ اور ذاتی قلمدان میں چھوٹے چھوٹے پرچے بھی پڑے رہتے تھے۔ اپنے گھر یا ذاتی پرچہ کہیں لکھنا ہوتا تھا، تو مدرسے کے قلمدان یا مدرسے کے کاغذ پر نہیں لکھتے تھے۔''

(آپ بیتی:۳۰)

مولانا یحییٰ صاحب رحمہ اللہ کی احتیاط

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ اپنے والد محترم حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''میرے والد رحمہ اللہ کا کھانا اس زمانے میں بازار سے آیا کرتا تھا، جو شام کو مدرسہ آتے بالکل جم جاتا تھا، میرے والد

صاحب سالن کے برتن کو مدرسے کے حمام کے قریب، حمام سے
باہر رکھ دیتے تھے، جب وہ نیم گرم ہو جاتا، تو نوش فرمالیا کرتے
تھے، اس پر بھی دو تین روپے ہر ماہ چندے کے نام سے اس دُور کی
آگ کی انتفاع کی وجہ سے دیا کرتے تھے۔'' (آپ بیتی: ۳۰)

علامہ یوسف بنوری رَحِمَہُ اللہُ کی احتیاط

علامہ بنوری رَحِمَہُ اللہُ مدرسے کی رقوم کے بارے میں بڑے محتاط تھے اور زکاۃ
کے مد کو نہایت احتیاط سے استعمال میں لاتے تھے؛ تاکہ اس کے مصرف سے ہٹ کر
وہ خرچ نہ ہو۔ اس سلسلے میں ایک ''جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاون'' کے ابتدائی دور کا ایک
واقعہ ''ماہنامہ بینات، علامہ بنوری نمبر'' میں درج ہوا ہے:

''آغازِ مدرسے کے دوسرے سال مدرسے کی حالت زکوۃ
فنڈ میں قابلِ اطمینان ہوگئی، ایک مرتبہ زکوۃ فنڈ میں پچیس ہزار
روپیہ جمع تھا؛ مگر غیر زکوۃ فنڈ خالی تھا، جب تنخواہیں دینے کا وقت
آیا، تو خازنِ مدرسہ نے حضرت مولانا (علامہ یوسف بنوری)
سے عرض کیا کہ مدرسین کی تنخواہوں کے لیے کچھ نہیں ہے،
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زکوۃ فنڈ سے قرض لے کر مدرسین کی
تنخواہیں ادا کر دی جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں اور فرمایا
کہ اس قرض کی ادائیگی کا کون ذمے دار ہوگا؟ موت و زندگی کا
کچھ بھروسہ نہیں، نیز فرمایا کہ میں مدرسین کی آسائش کے لیے
دوزخ کا ایندھن بننا نہیں چاہتا۔'' (بینات، علامہ بنوری نمبر: ۲۲۳)

اگر اس نوع کے ہمارے اکابرین کے واقعات جمع کیے جائیں، تو ایک بڑی جلد

تیار ہو جائے گی، یہاں بہ طور نمونہ چند کا ذکر کیا گیا ہے، یہ سارے واقعات ہمارے لیے عبرت وموعظت کا سامان ہیں، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم بھی مدارس کے اموال ورقوم کے سلسلے میں احتیاط برتیں۔

دارالعلوم پر ایک انگریز جاسوس کا تبصرہ

اخیر میں یہ گذارش کرتے ہوئے اپنی بات ختم کرتا ہوں، کہ ہر اعتبار سے مدارس کو عمدہ اور بہتر بنانے کی کوشش کرنی چاہیے، تعلیمی اور تربیتی اور انتظامی ہر لائن سے عمدگی اور حسن پیدا کرنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنا چاہیے اور مدرسے کو ایسا بنانا چاہیے، جیسے ایک انگریز جاسوس ''جان پامر'' نے جو انگریزی دور میں صوبۂ ''یوپی'' کے گورنر ''سر جان اسٹریچی'' کی طرف سے ''دارالعلوم'' میں خفیہ تحقیقات کے لیے بھیجا گیا تھا، اس نے اپنے ایک دوست کو پوری تفصیل کے ساتھ، وہاں کی تعلیمی وتربیتی سرگرمیوں اور وہاں کے طرزِ معاشرت اور اخلاق وتہذیب کے احوال ایک خط میں لکھنے کے بعد اخیر میں لکھا:

> ''میری تحقیقات کے نتائج یہ ہیں کہ یہاں (دارالعلوم، دیوبند) کے لوگ تعلیم یافتہ، نیک چلن اور نہایت سلیم الطبع ہیں، کوئی ضروری فن ایسا نہیں، جو یہاں نہ پڑھایا جاتا ہو، جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں کے صرفے سے ہوتا ہے، وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیے میں کر رہا ہے، مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہوسکتی اور میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پائے؛ تو نفع سے خالی نہیں۔ انگلستان میں اندھوں کا اسکول سنا تھا؛ مگر یہاں

آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریرِ اقلیدس کی شکلیں کفِ دست پر اس طرح ثابت کرتے ہیں، کہ شاید و باید، مجھے افسوس ہے کہ آج ''سر ولیم میور'' موجود نہیں ہیں؛ ورنہ بہ کمالِ ذوق وشوق اس مدرسے کو دیکھتے اور طلبہ کو انعام دیتے۔

(تاریخ دار العلوم دیوبند: ۱/۱۸۰-۱۸۱)

فقط

حررہ محمد شعیب اللہ خان

جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور
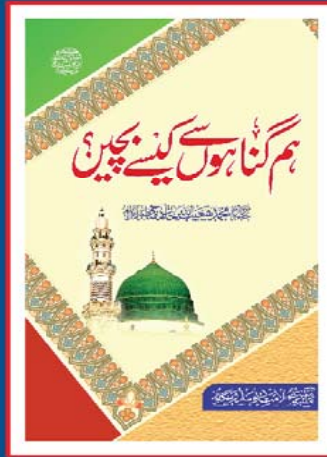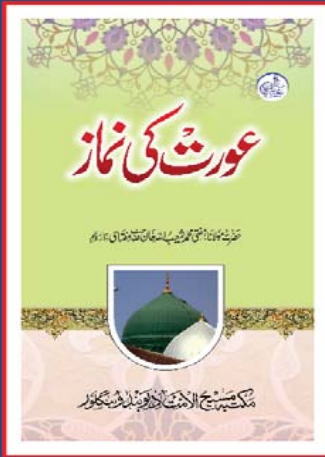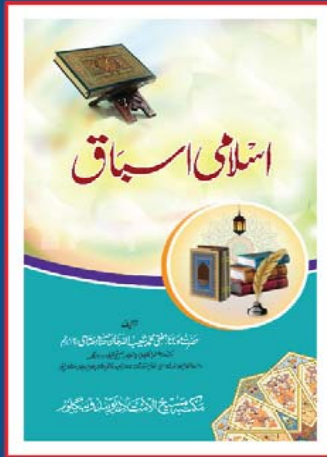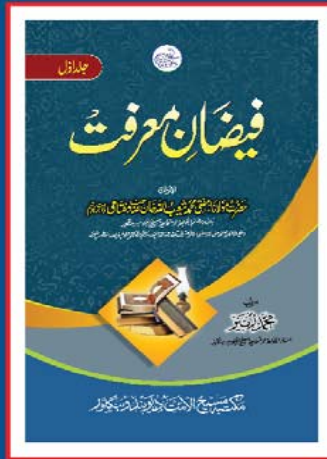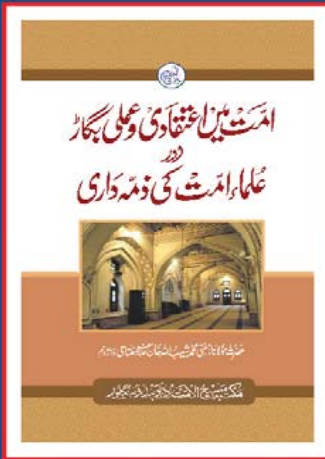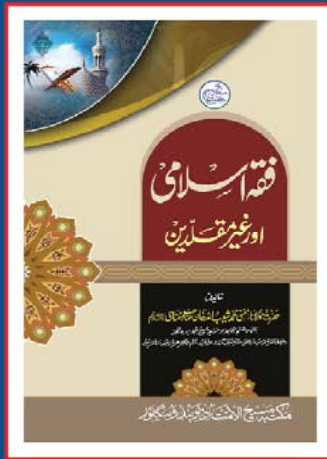
حضرت اقدس کی جملہ کتابیں مفت ڈاؤن لوڈ کرنے اور دیگر مزید گراں قدر
معلومات کے اضافہ کیلئے ہماری ویب سائٹ پر وزٹ کیجئے۔

www.muftishuaibullah.com

MAKTABA MASEEHUL UMMAT DEOBAND
Minara Market, Near Masjid-e-Rasheed, DEOBAND - 247554
Mobile: + 91-9634830797 / + 91- 8193959470

MAKTABA MASEEHUL UMMAT BANGALORE
84, Armstrong Road, Bangalore - 560 001 Mobile : +91-9036701512
E-Mail:maktabahmaseehulummat@gmail.com